چرخوف

سحر ہونے تک

ابنِ انشاء

سنگم پبلشرز لمیٹڈ ۔ لاہور

ساحر لدھیانوی

اور

حمید اختر

کے نام

اس درد کی بنا پر جو ان میں اور اس ناول کے ہیرو
نکولس میں مشترک ہے اور جسے سرخ سویرے سے پہلے
ہمیشہ "آوارگی" سے تعبیر کیا جائیگا۔

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اب ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

فیض احمد فیض

کربِ تنہا

۱۹۷۵

۱

حسبِ معمول گھنٹی بج اٹھتی۔ سگنل جھک جاتا اور پھک پھک کرتی ہوئی گاڑی لکڑی کے پلیٹ فارم پر آکھڑی ہوتی۔ بڑھیا چونک کر ڈبوں کی طرف لپکتی۔ وہ نہایت بے چینی سے ہر کھڑکی کے اندر جھانکتی تھی۔ ہر مسافر کی طرف غور سے دیکھتی تھی لیکن اس کا لڑکا کہیں نظر نہ آتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ ساری گاڑی چھان مارتی لیکن بے سود۔

چند منٹ بعد پہلے کی طرح سناٹا چھا جاتا۔ اب وہ ٹرین ہی تھی اور نہ مسافروں کی چہل پہل۔ سب لوگ اِدھر اُدھر بکھر جاتے اور پلیٹ فارم خالی ہو جاتا۔ رہ جاتی وہ مایوس بڑھیا اور اس کی سرد آہیں۔

اسی طرح وہ بلا ناغہ علی الصباح سٹیشن پر آئی تھی۔ میریا کتنے دنوں سے اپنے لختِ جگر کا انتظار کر رہی تھی۔ ہمیشہ ریل کی آمد آمد کی گھنٹی بجتی سیٹی کی آواز آتی ـــــ پھر وہی مانوس گھڑگھڑاہٹ، ہنگامہ اور چہل پہل لیکن نکولس کا کوئی پتہ نہیں۔

"خدایا! اس دیر کی کیا وجہ ہو سکتی ہے"۔ میریا سوچنے لگتی۔ "خدا کرے

وہ بخیر و عافیت ہو" بڑھیا مایوس ہو کر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگتی۔ اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور کبھی کبھی اس کے جھریوں بھرے گالوں پر ٹپک بھی پڑتے۔

ایک دن مقامی پولیس کا داروغہ اترا۔ ہوی بچے سٹیشن پر استقبال کے لئے آئے۔ دوسرے دن گاؤں کا پادری ڈبے سے نکلا۔ اسی طرح لوگ چڑھتے اترتے رہتے تھے۔ لیکن بڑھیا کا پیارا انگوس نظر نہ آتا تھا۔ کبھی کبھی کسی نیلی ٹوپی والے کو دیکھ کر بڑھیا لپک کر اس کے پاس پہنچتی۔ لیکن آخر مایوس ہو جاتی تھی۔

ایک دن اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ کرتے ہوئے وہ پلیٹ فارم جھاڑنے والے مہتر سے پوچھنے لگی۔ "یہ گاڑی کہاں جاتی ہے؟"

"ماسکو جائے گی"۔ اس نے جواب دیا۔

"اور آتی کہاں سے ہے۔ کیا کیف سے؟"

"ہاں کیف سے۔ کیف سے" ——— مہتر نے کچھ چڑ کر جواب دیا۔

بڑھیا نہایت آرزومندانہ نگاہوں سے اس سمت دیکھنے لگی۔ جدھر کیف واقع تھا۔ صبح کے دھندلکے میں اس کی نظر زیادہ دور نہ جا سکی پھر بھی اس کے تصور کے جھروکے میں سے ایک نیلی ٹوپی والے نوجوان طالب العلم کی شبیہ نمودار ہوئی۔ وہ اپنے بیٹے کے خیال میں ماحول سے بے گانہ ہی

ہوگئی ۔ اس کے چہرے پر ایک قسم کے حزن کے آثار ہویدا ہو گئے لیکن
اسی لمحے مسٹر پلیٹ فارم پر جھاڑو دیتا ہوا قریب آ گیا اور وہ نیلی ٹوپی والی
دھندلی تصویر دھوئیں کے بادلوں میں غائب ہو گئی ۔ اب وہی سونا پلیٹ فارم
تھا اور وہی ہولناک سناٹا ۔

نہ جانے کتنی آرزوؤں کے جلو میں میری یا پلیٹ فارم پر آتی تھی اور مایوس
ہو کر تنہا گھر لوٹتی تھی ۔ واپس ہوتے ہوئے اس کے پاؤں بوجھل ہو جاتے ۔
دل میں ایک کسک سی اٹھنے لگتی ۔ راستہ بھر وہ ٹھنڈی آہیں بھرتی جاتی ۔
اس کا چہرہ طرح طرح کے اندیشوں سے اندوہناک ہو جاتا ۔ اس وقت
وہ اتنی ستم زدہ اور آزردہ معلوم ہوتی تھی کہ دیکھنے والوں کے دلوں میں
خواہ مخواہ رحم کے جذبات موجزن ہو جاتے تھے ۔

کبھی کبھی گھر لوٹتے ہوئے اس کے ذہن میں یہ شبہ سر اٹھاتا ——
شاید بھیڑ بھاڑ میں میں نے دیکھ نہ پایا ہو ۔ شاید وہ گھر پہنچ گیا ہو اور اس
وقت وہیں موجود ہو ۔

اس خیال سے بڑھیا کی امیدوں کو ایک سہارا مل جاتا ۔ اس کے قدم
تیز تیز اٹھنے لگتے تھے ۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا تھا ۔ اسے
پورا یقین ہونے لگتا تھا کہ نکولس آ چکا ہوگا ۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اسے کچھ تشویش بھی ہونے لگتی تھی ۔ کہیں

اس کے آتے ہی اس کے ابّا اسے ڈانٹنے نہ لگیں۔ اب ڈانٹ ڈپٹ سے حاصل ہی کیا ہوگا۔ جو غلطی ہو چکی اس کی تلافی تو اب ممکن نہیں ہے ۔ یہ کیا کم خوش قسمتی کی بات ہے کہ لڑکا بخیر و عافیت گھر لوٹ آیا ہے ورنہ کس کا لڑکا بخیر و خوبی تعلیم ختم کر کے گھر لوٹتا ہے ۔

یہی باتیں سوچتے ہوئے میریا مکان کے احاطے میں داخل ہوتی تو اس کا دل اور بھی تیزی سے دھڑکنے لگتا تھا ۔

مکان طرح طرح کی بیلوں سے پٹا پڑا تھا ۔ مکان کی عمر بھی تقریباً اتنی ہی تھی جتنی میریا کی ۔ اور وہ بھی بڑھیا کی طرح کہن سال اور خستہ حال ہو چکا تھا ۔

میریا لڑکھڑاتی ہوئی مکان کی سیڑھیاں طے کرنے لگتی تھی ۔ دروازے کی چٹخنی کھسکاتے وقت تو اس کا دل کسی خفیہ اندیشے کے ماتحت اور بھی تیزی سے دھڑکنے لگتا تھا ۔ وہ خوف زدہ سی ہو کر کمرے کی طرف لپکتی ، لیکن وہاں اپنے خاوند کو اکیلا پا کر اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے تھے ۔ وہ مایوس ہو کر بیٹھ جاتی اور دھیمی آواز میں گنگنانے لگتی تھی ———

" نہیں آیا ! نہیں آیا ۔"

" میں تو پہلے ہی کہتا تھا ۔ کہ انتظار فضول ہے " ۔ بوڑھا سٹیفن ہاتھ پھیلا کر کہتا ۔" تم بیکار سٹیشن کے چکر کاٹتی ہو ۔ کیا اب بھی معاملہ تمہاری

سمجھ میں نہیں آیا۔"

میریا کچھ جواب نہ دے سکتی۔ تب وہ گھنٹوں آمنے سامنے بیٹھے بے مقصد اور ویران نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے تھے۔ دونوں کا دل کسی خفیہ کرب اور اضطراب کے زیر اثر ڈوبنے لگتا تھا۔

جب تک میریا سٹیشن سے نہ لوٹتی تھی۔ اس کا خاوند پھٹے ہوئے سلیپر پہنے اپنے کمرے ہی میں ٹہلا کرتا تھا۔ وہ بیچارا بہت گھبرانے لگتا تھا۔ لیکن بار بار کھانس کر اس گھبراہٹ کو چھپانے کی ناکام کوشش کیا کرتا تھا۔ جب میریا اکیلی لوٹتی تو وہ غرّا کر اسی مانوس لہجہ میں کہنے لگتا۔" اب انتظار فضول ہے۔ بے کار ہے۔"

دیوار گیر گھڑی مسلسل ٹک ٹک سے اس سناٹے کے افسوں کو توڑتی رہتی تھی۔ لیکن وہ بھی شاید بوڑھے سٹیفن ہی کے الفاظ دہراتی تھی" اب انتظار فضول ہے۔ بے کار ہے۔"

کبھی کبھی مقامی بینک کا ایک محرّر جو سٹیفن کا دوست تھا ان کے ہاں آیا کرتا تھا اور سیاسی قیدیوں کے بارے میں ایسی ایسی خوفناک باتیں سنایا کرتا تھا کہ میاں بیوی کانپنے لگتے تھے۔

" جانتے ہو ایسے مجرموں کو کہاں رکھا جاتا ہے"؟ محرّر کہنے لگتا" قلعے

تاریک تہ خانے ہیں۔ ایسی کوٹھری میں جس کی چھت میں کھڑکیاں ہوتی ہیں اور جن کی دیواروں میں چھید۔"

تب وہ کئی قسم کی بے سروپا گپیں ہانکنے کے بعد بیان کیا کرتا تھا کہ کس طرح ان سوراخوں سے پانی کا تریڑا دے کر قیدیوں کو ڈبو دیا جاتا تھا۔ وہ کہا کرتا "میں نے خود اس نظارے کی تصویر دیکھی ہے۔ ایک لڑکی اپنی کوٹھڑی میں سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اور دیوار کے سوراخوں سے پانی کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔"

"میرے خدایا۔ میرے مالک"۔ بڑھیا دہشتناک داستانیں سن کر چیخ اٹھتی اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے۔

"سرکار ایسے مجرموں کو عموماً پھانسی ہی دیتی ہے۔" محرّر نہایت معتبر اور باوثوق لہجے میں کہتا —— "ہاں کبھی کبھی معاف بھی کر دیتی ہے۔ لیکن ایسا اتفاق شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔"

اسی طرح انقلابیوں کے متعلق سو طرح کی گپیں سنا سنا کر وہ بچارے بوڑھوں کی جان ہلکان کر دیتا تھا۔ اس کی باتیں سن سن کر سٹیفن اور میریا اتنے دہشت زدہ ہو جاتے تھے کہ وہ رات کو سو بھی نہ سکتے تھے۔ تمام رات آہیں بھرتے ہوئے کمرے میں ادھر اُدھر ٹہلا کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ جب میریا سٹیشن سے اکیلی لوٹتی تو اس کا خاوند کہا کرتا —— "اب اسے

دوبارہ دیکھنے کی تمنا کرنا فضول ہے۔"

سٹیفن اس وقت جوش کی حالت میں یہ الفاظ کہہ تو دیتا لیکن پھر تھوڑی دیر بعد مکان کے باہر آجایا کرتا تھا۔ باغیچے میں ان کی ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ جسے وہ لوگ "گوشہ تنہائی" کہا کرتے تھے۔ بوڑھا اسی کوٹھڑی میں گھس جاتا اور اندر سے دروازہ بند کر لیتا تھا۔ تب بیٹھے بیٹھے وہ ایک نادان بچے کی طرح سسکیاں بھرنے لگتا تھا۔ وہ جی بھر کر رو لیتا اور تنہائی کے ان پُراسرار لمحات میں مایوس ہو کر دعا کیا کرتا تھا "خدایا۔ مہربان خدایا۔ بس وہ زندہ ہو اور خیریت سے ہو۔ مجھے اور کسی چیز کی خواہش نہیں"

ایک دن جب سٹیفن کام پر گیا ہوا تھا۔ اور میریا باورچی خانہ میں کچھ کام کر رہی تھی۔ ایک پرانی گھوڑا گاڑی کھڑکھڑاتی ہوئی مکان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

بڑھیا کے ہاتھوں سے جھاڑو چھوٹ گئی اور وہ چونک کر کھڑکی میں سے جھانکنے لگی۔ گاڑی کے قریب ایک خوش قیمین نوجوان کھڑا تھا۔ وہ طالب علم معلوم ہوتا تھا اور اس کا لباس کالج کے لڑکوں ایسا تھا۔ پاس ہی ایک پرانا بکس رکھا تھا۔ نوجوان اس بکس کو اٹھانے کے لئے کوچبان کا انتظار کر رہا تھا۔

اگرچہ وہ نوجوان اس وقت مکان کیطرف پیٹھ دے کے کھڑا تھا لیکن

بڑھیا کا اس پرانے بکس پر نظر پڑ جانا کافی تھا۔ ایک لمحہ توقف کئے بغیر وہ دروازے کی طرف لپکی

"اوہ کولیا ——— میرے لال" ——— چلاتی ہوئی بڑھیا اس لڑکے سے لپٹ گئی۔ مامتا کی ماری کا کلیجہ اتنا امڈ آیا تھا کہ وہ ہنستی بھی جاتی تھی اور آنسو بھی بہاتی جاتی تھی۔ اسے یقین ہی نہ آتا تھا کہ اس کا بیٹا واپس آ گیا ہے۔ وہ بار بار اس کا منہ چوم کر پوچھ رہی تھی "تو خیریت سے تو ہے۔ تو اچھا تو ہے؟"

"ہاں مزے میں ہوں"۔ لڑکے نے جواب دیا۔

"ارے بیٹا۔ ہم دونوں تو تیرے متعلق نہ جانے کیا کیا سوچ کر مر رہے تھے"۔ میر یا روندھے ہوئے گلے سے بولی ——— "کیا انہوں نے تجھے معاف کر دیا بیٹا؟ ——— میرے خدایا ——— آج میرا کولیا ———"

اس کا دل بھر آیا اور وہ رونے لگی۔

نکولس نے مسکراتے ہوئے ماں کی ڈھارس بندھائی۔ نوجوان کا چہرہ ستا ہوا سا نظر آ رہا تھا۔ اس کے اطوار سے اداسی جھلک رہی تھی اور وہ اپنی ماں کے لاڈ پیار سے کچھ کچھ گھبرایا نظر آتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے بہت دنوں سے ایسا اشتیاق اور لاڈ پیار دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔

لیکن میریا کی مسرت بے پایاں تھی - اس کا دل نامعلوم بلندیوں پر پرواز کر رہا تھا - وہ بار بار کہہ رہی تھی "لا بیٹا - یہ بکس میں اُٹھا لوں - ارے ہماری تو سب اُمیدیں دم توڑ چکی تھیں - میں ہمیشہ سٹیشن پر جاتی تھی - لیکن کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ تیرا کیا حال ہوگا"۔

"کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی"۔ نکولس نے سادگی اور لا پرواہی سے کہا۔ "میں ذرا کچھ دنوں کے لئے قید ہو گیا تھا ——"

"ہیں؟ کیا اسی قلعے کے تہ خانے میں؟" بڑھیا چونک کر چلّا اٹھی "تب تو واقعی خداوند نے میری دعا سنی ہوگی - اسی کی مہربانی سے تو ہمیں دوبارہ ملا ہے - لیکن اب تو انہوں نے پوری طرح معاف کر دیا نہ تجھے ——؟"

"نہیں —— پوری طرح تو نہیں"۔ لڑکے نے کچھ گھبرا کر کہا "مجھے مشروط طور پر رہا کیا گیا ہے اور اب آپ کے پاس رہنے کے لئے بھیجا ہے"۔

"بیٹا - میں نے سٹیشن پر ایک طالب علم سے تمہارے متعلق پوچھا تھا - لیکن وہ تو کچھ بھی نہ جانتا تھا"۔

"ہم ایک دوسرے کو کیسے جان سکتے ہیں ماں!" نکولس بولا "مجھ ایسے تو سینکڑوں طالب علم ہیں"۔

"ارے تو نحیف اور کمزور بھی کتنا ہو گیا ہے۔" ماں نے کہا "تمہیں ضرور بھوک لگ رہی ہو گی۔ چلو جلدی کھانا تیار کرتی ہوں" +

۲

آخر نکولس پھر اپنے گھر آ گیا۔

گھر میں ہر چیز اصلی حالت پر تھی۔ کمرے پہلے کی طرح صاف ستھرے تھے۔ کھڑکیوں پر پردے لگے ہوئے تھے۔ باغیچے میں وہی پرانی بیلیں کمروں میں بھی حسب سابق کہیں گلدان دھرے تھے تو کہیں گھڑی ٹک ٹک کر رہی تھی۔ کمرے میں رکھی ہوئی گول میز اور اس کے پاس ہی بچھا ہوا خاکی گدوں والا صوفہ نکولس کو بھولی ہوئی ساعتیں یاد دلا رہا تھا۔ صوفے کی پھولدار چادر تو اسے اتنی مانوس معلوم ہو رہی تھی جیسے وہ اپنی زندگی کی اولیں ساعت سے اسے پہچانتا ہو۔

کھڑکیوں کے درمیان کی دیوار پر اخبار کی ایک صاف ستھری فائل لٹک رہی تھی۔ میز پر وہی برسوں پرانی دوات پڑی تھی۔ کھڑکی سے باہر وہی ہرا بھرا میدان اور وہی سونی سڑک نظر آ رہے تھے۔ مکان کے ایک کونے میں وہی پرانا کبوتر خانہ تھا اور احاطے کے پھاٹک پر حسب سابق پون چکی کا ایک چھوٹا سا نمونہ نصب تھا۔ میدان میں بطخیں اپنے

ننھے ننھے بچوں کے ساتھ پھدک رہی تھیں۔ چار دیواری کے پاس ہی جھاڑیوں میں ایک پالتو سؤر کان پھٹ پھٹاتا ہُوا اونگھ رہا تھا۔

یہ سب کچھ دیکھ کر نکولس مسکرا دیا۔ اسے ایسا محسوس ہُوا جیسے یہ بطخیں اور سؤر اس سے ایک لمحے کے لیئے بھی کبھی جدا نہیں ہوئے نیلگوں آسمان پر ابر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ قریب ہی گاؤں نظر آرہا تھا۔ وہ اس وقت کتنا سہانا اور نظر فریب دکھائی دے رہا تھا! ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ آسمان کی پُرسکوں پہنائی کے نیچے بےنچنت ہو کر سستا رہا ہو۔ ارد گرد کا خوبصورت ماحول ایک طرح کی نیند میں مدہوش تھا۔ ابابیلیں آسمان میں اونچی پرواز کر رہی تھیں۔ پاس ہی جھاڑی پر ایک کوّا آرام کر رہا تھا۔ اس کی چونچ کھلی ہوئی تھی اور پر سمٹے ہوئے تھے۔ نالے کے قریب ہی ایک کتا نظر آرہا تھا۔ وہ بھی اداس معلوم ہوتا تھا اور زبان باہر نکالے ہانپ رہا تھا۔ ایک کسان سڑک پر نیچی نگاہیں کیئے اپنی دھن میں مست چلا جا رہا تھا۔ اس کے چلنے سے سڑک کی دھول اُڑ رہی تھی۔ قریب ہی دو لڑکے نظر آرہے تھے۔ ایک لٹھ کا لکڑی کی سواری کرتا ہُوا دوڑ رہا تھا اور دوسرا چلا چلا کر رو رہا تھا۔ شاید پہلے لڑکے نے اس کا گھوڑا چھین لیا تھا۔ بکائن کی جھاڑیوں پر پرندے چیں چیں کر رہے تھے۔ وہ اس طرح آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ جیسے ہاٹ کے دن

دیہاتی عورتیں۔ ایک چڑیا پھدکتی ہوئی کھڑکی کے قریب ایک ڈال پر آکر بیٹھ گئی اور نکولس کی طرف نہایت غور اور انہماک سے دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد دو چڑیاں اور آ کر بیٹھ گئیں اور شور مچانے لگیں۔

نکولس کھڑکی کے پاس آکر بیٹھ گیا اور سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ اسکا جی اداس ہو رہا تھا۔ آج صبح گھر آتے وقت اس کے دل میں مسرت کے جو جذبات امڈ رہے تھے وہ جانے کہاں غائب ہو چکے تھے۔ وہ خوشی اب ہنگامی اور مصنوعی معلوم ہو رہی تھی۔

نکولس کو یہ پرسکون ماحول بہت سونا معلوم ہونے لگا۔ وہ سڑک وہ بطخیں، وہ کاہک اور وہ اونگھتا ہوا اسٹور۔ سب کے سب کتنے اداس نظر آ رہے تھے۔ نکولس سوچ رہا تھا۔ یہاں کسی کو شہر کی ہلچل و گہما گہمی کا خیال بھی نہیں ہے۔ کسی کو اتنا سوچنے کی فرصت نہیں کہ اس وقت دنیا میں کتنے عظیم حادثات واقع ہو رہے ہیں۔ شہروں میں زندگی کتنی مشغول ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پانی ابل رہا ہو لیکن یہاں کے لوگوں کے لئے اس ہلچل۔ اس گہما گہمی کی کیا اہمیت ہے لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے حالات جو ایک شہری کے لئے بہت اہمیت رکھتے ہیں یہاں کے لوگوں کے دلوں میں ان کی کیا قدر و قیمت ہے؟

سوچتے سوچتے نکولس کو محسوس ہوا جیسے اس کی اپنی زندگی بھی

دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہو۔ شہر کی چہل پہل میں بیتا ہوا دور اور دیہات کے
پرسکون ماحول میں گزرے ہوئے ایام، دونوں میں کتنا فرق ہے۔؟
وہ سوچنے لگا۔ شہر کی گہما گہمی میں گزرا ہوا زمانہ ایک بھولی بسری داستان
کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ یہ ماحول فطرت کے اصولوں کی طرح کتنا اٹل
اور غیر متغیر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انسان کا سچا جیون یہی دیہاتی
زندگی ہے۔

"کولیا! تجھے مچھلی بھاتی ہے نا؟" اس وقت پیچھے سے آواز آئی۔

نکولس نے مڑ کر دیکھا۔ دروازے میں میریا کھڑی تھی۔

"لے بیٹا۔ ذرا ناشتہ کر لے۔" بڑھیا نے گرم گرم کھانے کی سینی
میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھ تو سہی۔ یہ چیزیں تو تجھے بہت مرغوب تھیں۔"

تب وہ ایک عجیب انداز سے بولی "مجھے معلوم نہیں۔ تم لوگ
کیوں باغی بن بیٹھتے ہو۔ تمہیں کمی کس بات کی ہے؟"

چولھے پر مکھن اُبل رہا تھا۔ اس لئے بڑھیا بیٹے کا جواب سننے سے
پہلے ہی باورچی خانے کی طرف دوڑی۔ حقیقت تو یہ تھی۔ کہ باغی نوجوانوں
کے مطالبات کا خیال کرنے کی بڑھیا کو کچھ ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ ایک طشت میں روٹیاں رکھ کر لائی اور انہیں
میز پر رکھ کر کہنے لگی۔ "دیکھو بیٹا! اپنے اباجان سے جھگڑنا مت ممکن ہے

وہ ناراض ہوں۔ لیکن ان کی خفگی زیادہ دیر کے لئے نہیں ہوتی۔ میری رائے میں تم ان کی باتیں مان لینا۔ آخر وہ ضعیف العمر اور جذباتی ہیں۔ تم تو ابھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھ ہی رہے ہو۔ لیکن ان کی تو زندگی ہی گزر چکی ہے اور تم جانتے ہو کہ باقاعدہ زندگی گزارنے میں اور ادھر اُدھر بھٹکتے پھرنے میں کافی فرق ہے"۔

"اچھا۔ اچھا!" نکولس قطع کلام کر کے بولا" اباجان گھر کس وقت لوٹتے ہیں؟"

"وہی تین بجے کے قریب"۔

"اور آج کل وہ کام کہاں کرتے ہیں؟"

"اسی دفتر میں"۔ بڑھیا نے جواب دیا۔ "ان کی تنخواہ بھی وہی ہے بیٹا! آج تک کچھ بھی ترقی نہیں ہوئی۔ پھر بھی خدا کا شکر ہے جو اتنا مل رہا ہے۔ کیونکہ تمہارے ابا تو اب لکھ بھی نہیں سکتے۔ ان کے ہاتھ اتنے کانپتے ہیں کہ ——"

"کانپتے ہیں؟" نکولس نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہاں بیٹا! انہیں رعشہ ہو گیا ہے۔ میں نے تمہیں ایک دفعہ اس سلسلہ میں لکھا بھی تھا۔ مجھے امید تھی کہ تم ——"

بڑھیا کہتے کہتے رک گئی۔ "اچھا اب کھانا کھا لو۔ ان باتوں کے

دہرانے سے اب کیا حاصل ہے۔"

نکولس کھانا کھانے لگا۔ لیکن اس کی نگاہیں اپنی والدہ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا۔ میری دو ہی سال کی غیر حاضری میں امّاں کتنی بوڑھی نظر آنے لگی ہے۔ بال سفید ہو گئے ہیں۔ منہ لٹک گیا ہے ہاتھ بھی کتنے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں۔ اب تو کمر بھی جھک گئی ہے۔

ادہر میریا بار بار بے چینی سے گھڑی دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ سٹیفن جلد لوٹے اور اپنے بیٹے کو دیکھ کر آج کی خوشی میں ہاتھ بٹائے۔ لیکن بڑھیا کچھ کچھ اندیشناک بھی ہو رہی تھی۔ اسے ڈر تھا۔ کہ سٹیفن جوش میں آکر کہیں بیٹے کو ضرب پہنچا بیٹھے یا نکولس ہی کہیں اپنے والد کو کوئی چبھتی ہوئی بات نہ کہہ دے۔ میریا انہی خیالات سے سراسیمہ سی ہو رہی تھی۔ اس کے دل میں بیک وقت بیم و مسرت کے جذبات اُمڈ رہے تھے۔

"ابھی ان کے آنے میں دو گھنٹے کی دیر ہے"۔ بڑھیا نے اپنے بیٹے کو پیش از وقت مطلع کر دینے کی نیت سے کہا "آج کل ان کے دفتر میں اتنی مکھیاں ہیں۔ کہ تمہارے ابا تنگ آجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر چڑے ہوئے سے گھر لوٹتے ہیں۔"

ادہر نکولس کے دل میں بھی ایک ہلچل مچ رہی تھی۔ وہ بھی اپنے والد

سے جلد ملنے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اسے یہ خوف بھی دامنگیر تھا کہ ابا اسے طرح طرح کے الزامات لگا کر ڈانٹنے نہ لگیں حقیقت تو یہ ہے کہ اسے کوئی چاہے کتنا ہی سمجھاتا۔ نکولس کا اعتقاد تھا کہ اس نے جو اقدام کیا تھا وہ بالکل درست تھا۔ بلکہ اس کے علاوہ کوئی اور راہ عمل تھی ہی نہیں۔ اسلئے والد سے اگر اس موضوع پر گفتگو چھڑ گئی تو ممکن ہے کچھ بدمزگی ہو جائے۔ یہ سوچ کر نکولس مضطرب ہو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے کوئی غلطی نہیں کی تاہم اس کے دل میں بے چینی سی پیدا ہو رہی تھی اور وہ کچھ کچھ تھبیب سا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے گھڑی کی طرف نظر اٹھائی۔ سوئی تین کی جانب کھسک چلی تھی۔

" لو بابا بھی کیسے ٹھیک وقت پر آ رہے ہیں"۔ لڑکے نے کھڑکی سے جھانک کر کہا۔

واقعی سامنے میدان میں شٹیفن آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ نکولس نے دور ہی سے پہچان لیا۔ بوڑھا بڑی آن بان سے قدم رکھتا تھا۔ دراصل بات یہ تھی کہ شٹیفن اپنے آپ کو کوئی معمولی آدمی نہ سمجھتا تھا۔ وہ اپنا شمار گاؤں کے گنے چنے معزز لوگوں میں کیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے اوضاع واطوار عالی خاندانوں کے لوگوں

ایسے رکھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے سر پر بھورے رنگ کی چمکیلی ٹوپی تھی جس پر ایک تمغہ لگا ہوا تھا۔ ہاتھ میں ایک چھا سا چھاتا تھا اور بغل میں کاغذات کا بستہ۔

"بابا اپنے ہاتھوں میں کیا لئے ہیں؟" نکولس نے اپنی والدہ سے پوچھا۔

"وہ ان کا بستہ ہے"۔ میریا نے ملائمت سے جواب دیا"۔ اس میں خواہ کچھ نہ بھی ہو۔ وہ اس کو اپنے ساتھ ضرور رکھتے ہیں۔ یہی چھاتے کا بھی حال ہے۔ چاہے برسات نہ بھی ہو تو بھی یہ چھاتا ان کے ہاتھ میں رہا کرتا ہے۔"

سٹیفن اس وقت بطخوں کے پاس سے گزر رہا تھا۔ اپنے بچوں کے قریب آتے دیکھ کر ایک بطخ اس کی طرف دوڑی۔ وہ اپنی گردن لمبی کر کے بوڑھے کے پاس اس طرح آئی جیسے کاٹنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ سٹیفن رک گیا اور اپنی انگلی اٹھا کر اسے پچکارنے لگا۔ بطخ نے اپنی گردن جھکالی اور اپنے بچوں میں جا ملی۔

"اوہو! آگئے!!" بوڑھے نے مسکرا کر کہا۔ لیکن اس نے اپنی رفتار کو آہستہ کیا اور نہ تیز۔ بیٹے کو دیکھ کر اس کے دل کو کچھ بہت زیادہ خوشی نہ ہوئی۔ نکولس کے آنے کی خبر اسے دفتر ہی میں مل گئی تھی۔ پھر بھی

اس نے آنے میں جلدی نہ کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بڈھا اپنے جذبات کے بہاؤ کو اس الھڑ نوجوان پر ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا گزشتہ رات ہی اس نے نکولس کے متعلق کتنا بھیانک خواب دیکھا تھا۔ اسے یوں نظر آیا کہ عدالت نے نکولس کے قتل کا حکم دے دیا ہے اور وہ اپنے والدین سے آخری وداع ہونے آیا ہے۔ اس کے بال پریشان ہیں۔ ہونٹ خشک اور پھٹے ہوئے ہیں۔ چہرہ زرد ہے اور پاؤں ننگے ہیں —— سٹیفن اس خواب کو یاد کر کے اب بھی کانپ اٹھا تھا۔

"بابا —— !" نکولس چلا اٹھا اور اپنے والد کے گلے سے لپٹ گیا۔ بوڑھے نے بھی اسے چھاتی سے لگا لیا۔ لیکن سٹیفن کا خلوص رسمی سا تھا۔ اس میں شدّت اور تأثر نام کو نہ تھے۔

"کیا تمہیں آئے بہت دیر ہو گئی ہے؟" اس نے کھانستے ہوئے پوچھا۔

"میں آج صبح ہی آ گیا تھا۔" لڑکے نے جواب دیا۔

"خوب۔ مجھے بہت مسرّت ہوئی۔" سٹیفن نے ایسے لہجے میں کہا جیسے کسی اجنبی مہمان کا خیر مقدم کر رہا ہو۔

بڑھیا بھی مکان کی سیڑھیوں پر آ گئی تھی۔ لیکن وہ باپ بیٹے کی ملاقات کا منظر نہ دیکھ سکی۔ جب اس نے دیکھا کہ دونوں چپ چاپ گھر کی

جانب چلے آرہے ہیں۔ نہ ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں نہ نظریں
اوپر اٹھاتے ہیں تو وہ گھبرا گئی۔ اس نے دیکھا کہ معاملہ بے ڈھب ہے
اسلئے خود دخل انداز ہونا ضروری سمجھا۔

" خداوند کا شکر ادا کرو سٹیفن! ہمارا کولیا گھر لوٹ آیا" وہ بولی" تم
نے مجھے اپنے کل والے خواب کا حال سنا کر ناحق پریشان کر دیا تھا۔ دیکھو
یہ تو مزے میں ہے۔ اچھا چلو اب کھانا کھا لو۔ لیکن آج تم اداس کیوں
ہو۔ کیا دفتر میں آج بھی مکھیوں نے بہت ستایا ہے ؟"

سٹیفن فوراً بھانپ گیا کہ اس کی بیوی کیوں اس وقت مکھیوں
کا تذکرہ کر رہی ہے۔ لہذا اس نے کچھ جواب نہ دیا۔

کھانے کے دوران میں بھی بوڑھا بہت سنجیدہ رہا۔ وہ اس انداز
سے کھا رہا تھا جیسے کوئی رسم ادا کر رہا ہو۔

" اچھا"! آخرکار بوڑھے نے پوچھا" تو تم جیل کی ہوا کھا آئے ؟"

" جی ہاں"۔ نکولس نے آہستگی سے جواب دیا۔

" اور اب مشروط طور پر رہا کئے گئے ہو ؟"

" جی ہاں"۔

بوڑھا کچھ دیر تک چپ رہا اور اب زیادہ کھل کر بات چیت کرنے لگا

" اور اب کیا کرنے کا ارادہ ہے بھئی ؟"

"کچھ دن بعد پڑھنا شروع کر دوں گا"۔ نکولس نے دبی زبان سے کہا
"اس کے تو یہ معنی ہوئے۔ کہ پھر سے بسم اللہ کرو گے"۔ سٹیفن کہنے
لگا۔" اور اگر انہوں نے دھکے دے کر نکال دیا تو؟ پھر نئے سرے
سے ابتدا کرو گے۔ کیوں!"

"خیر۔ یہ ابتدا اور انتہا کے قصے تو چلتے ہی رہتے ہیں"۔ بڑھیا معاملہ
کو الجھتے دیکھ کر بول اٹھی۔" خدا نے چاہا تو کولیا کی تعلیم بھی ایک دن مکمل
ہو جائے گی۔"

"ارے انتہا تو سب چیزوں کی ہوتی ہے میریا!" بوڑھا اپنا منہ پونچھتا
ہوا قدرے روکھے پن سے بولا" یہ تو فطرت کا اٹل قانون ہے ہی۔ ہم
دونوں کا بھی ایک دم آخری وقت آ پہنچے گا۔"

تب لڑکے کی طرف متوجہ ہو کر اس نے پھر پوچھا۔
"تمہارے سکول سے نکالے جانے کی وجہ کیا تھی میری؟"
"میں نے احتجاج اور ہلچل میں کچھ حصہ لیا تھا۔"
"اوہو۔ اور قید کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"
"میں نہیں جانتا۔"

"اچھا۔ لیکن دنیا میں کوئی کام بلا وجہ نہیں ہوتا سمجھے؟" سٹیفن نے
قدرے درشت لہجہ میں کہا۔" کولیا! دراصل مجھے تم سے یہ توقع نہ تھی

تم نے ایک تماشہ بنا ڈالا۔"

"تماشا؟ یہ تو خوب کہی آپ نے" لڑکے نے گنگنا کر کہا۔ وہ اس وقت انگلیوں سے اپنے بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔

"اُف۔ کیا اسی لئے ہم لوگوں نے آٹھ سال تک تمہاری فیسیں ادا کیں۔ کتابیں خریدیں اور پرورش کی۔ کیا اسی لئے ہم نے تمہیں پال پوس کر جوان کیا"؟ سٹیفن مشتعل ہو کر کہنے لگا" ہم تو امید رکھتے تھے کہ ایک دن پڑھ لکھ کر تم بڑے بنو گے اور ہماری محنت کا صلہ دو گے۔ سوچا تھا ہماری ساری محنت کسی بہتر شکل میں ہمارے ہی پاس آئے گی لیکن اب تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسری دنیا میں ہی اس کا بدلہ ملے گا۔ اور وہ بھی جلتے انگاروں کی صورت میں۔"

"رہنے بھی دو نا" اسی وقت پھر میریا درمیان میں بول اٹھی۔ اس نے دیکھا کہ گفتگو کا سلسلہ غلط راستہ اختیار کر رہا ہے " اس میں اس کی روٹیاں گننے کی کیا ضرورت ہے۔ دنیا میں سبھی لوگوں کے بال بچے ہوتے ہیں۔ سب اپنے بیٹی بیٹے کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ کیا صرف تمہارا ہی لڑکا ہے اور لوگوں کے لڑکے ہی نہیں ہیں؟ اور اگر لڑکے کو کپڑوں اور کتابوں کی ضرورت پڑتی ہے تو اس میں اس بچارے کا قصور ہی کیا ہے؟ تو یہ اس طرح اس کے کپڑے لتے گنانا کیا دانشمندی ہے"

یہ فعل نامناسب ہی نہیں بہت بڑا گناہ بھی ہے۔"

"نہیں نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" بوڑھا گھبرا کر کہنے لگا "شاید سہواً میری زبان سے کوئی نامناسب کلمہ نکل گیا ہو۔ ارے بھئی۔ ہم لوگوں کو اس سے کیا غرض ہے۔ اب ہم بوڑھوں کی زندگی ہی کتنی ہے اور ہمیں کپڑے لتے گننے سے فائدہ ہی کیا ہوگا ——— واقعی اگر اشتعال میں کوئی لفظ میری زبان سے نکل گیا ہو تو مجھے افسوس ہے۔ میرا تو مطلب صرف یہ تھا کہ لڑکا جلد تعلیم ختم کر کے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے وہ برسر روزگار ہو جائے تو ہم چین کریں۔ کوئی بات بڑھانے چڑھانے کی تو اس میں نہیں۔ کیا ہر شخص اپنے آرام کا خیال نہیں سوچتا۔"

"سب کو آرام کی فکر ہے۔" نکلس دبے لہجے میں بولا "لیکن ہر شخص کے آرام کا معیار مختلف ہے۔ کسی کو عزت اور وقار ہی سکھ سے زیادہ عزیز معلوم ہوتے ہیں۔"

"ہاں۔ فاقوں کی نوبت پہنچ جانے میں ہی تو بڑی بھاری عزت ہے گویا" بوڑھے نے چمک کر کہا۔ "سچ ہے۔ ہم بوڑھے لوگ آپ کی باتیں کیا سمجھیں۔ خدا ہم سے ناکارہ لوگوں کو زندہ ہی کیوں رکھتا ہے۔ ہم کو تو جیتے جی قبروں میں دفنا دینا چاہیئے۔"

میریا نے غضب آلود نگاہوں سے سٹیفن کی جانب دیکھا۔ اور چپ

رہنے کا اشارہ کیا۔ تب وہ بیٹے کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی "تم نے تو اس نامراد گفتگو میں پڑ کر کچھ کھایا ہی نہیں بیٹا!"

"شکریہ۔ مجھے اب کسی شے کی حاجت نہیں۔"

"شکریہ کی کیا حاجت ہے۔" بوڑھے نے ایک آہ بھر کر کہا۔

نکولس نے ٹوپی سر پر رکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیوں۔ کہاں چلے بیٹا؟" بڑھیا نے فکرمند ہو کر کہا۔

"کچھ نہیں۔ ذرا گھومنے جا رہا ہوں"۔ اور نکولس اٹھ کر چل دیا۔

جب نکولس مکان کی سیڑھیاں اتر کر چلا گیا۔ تو کمرے میں ایک غیظ آلود سرگوشی شروع ہو گئی۔ میریا اپنے خاوند کو ڈانٹ رہی تھی۔

"تم تو ہاتھ دھو کر بچارے کے پیچھے پڑ گئے۔ کچھ بھی ہو۔ ہے تو ہمارا اکلوتا فرزند۔ اور وہ بچارا ڈینگیں کہاں مارتا ہے۔ وہ تو الٹا رحم کا مستحق ہے"

اور سٹیفن بار بار دبی زبان سے کہہ رہا تھا۔

"میں نے اسے کونسی ایسی بات کہہ دی میریا! میں نے تو اسے کچھ کہا بھی نہیں"۔

۴

نکولس ٹہلتے ٹہلتے گاؤں سے بھی آگے نکل آیا۔ وہ سڑک کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ آس پاس کے درختوں کی ڈالیاں جھک رہی تھیں۔ نکولس ان کے چکنے پتے توڑتا جاتا تھا اور اپنے ہاتھوں میں مسلنے لگتا تھا۔ کبھی کبھی وہ سیٹی بجانے لگتا تھا۔ لیکن اس کی ہر حرکت سے ایک طرح کی افسردگی مترشح تھی۔ اور اس کا ذہن طرح طرح کے افکار کی جولانگاہ بنا ہوا تھا۔

چلتے چلتے وہ ایک جگہ رک گیا اور ارد گرد کا منظر دیکھنے لگا۔ افق تک گیہوں کے ہرے بھرے کھیت مواج سمندر کی طرح لہرا رہے تھے۔ مرغزار حدِ نظر تک پھیلا ہوا تھا۔ ہر چہار طرف سناٹا چھا رہا تھا۔ صرف ایک چڑیا فضا میں اڑتی ہوئی چہچہا رہی تھی یا قریب کی کسی جھاڑی میں چھپی ہوئی کوئل اپنی میٹھی اور اداس راگنی سے فضا کو گونجا دیتی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر نکولس کے دماغ میں طرح طرح کے بجھے بجھے خیالات سر اٹھانے لگے اور حزن و یاس کا پرتو اس کے چہرے کے نقوش سے

نمایاں نزہونے لگا۔

وہ سوچنے لگا ----- یہاں ہر چیز اپنے دھیان میں مگن ہے
شہر کی وہ سب چیزیں جن سے انس ہو جاتا ہے اس کے مقابلہ میں کتنی
عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ شہر میں جو باتیں بہت اہم گردانی جاتی ہیں انہیں
یہاں کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ یہاں سب سے مقدم چیز صحت ہے۔
اور اگر ہر چیز اپنی اپنی فطرت کے مطابق تندرست رہے تو زندگی کا
سارا معمّہ ہی حل ہو جاتا ہے۔ کاش! سب لوگ اس پرسکون اور شاداب
منظر کو دیکھتے رہیں اور کائنات کی ازلی موزونیت اور حسن پر غور
کرتے رہیں۔ اس شفیق آسمان کے زیرِ سایہ کسی اور شے کی ہوس رکھنا
لاحاصل ہے۔ جیسے یہ بے داغ نیلگوں آسمان۔ یہ حسین کائنات اور
یہ پرسکون ماحول کسی چیز کے تمنائی نہیں ہیں اسی طرح ہمیں بھی نت
نئی آرزوؤں اور نادیدہ منزلوں کے لئے مضطرب نہ ہونا چاہیئے۔
جاڑے کے بعد حسبِ معمول بہار آئے گی اور بہار کے بعد جاڑا -----
برف پوش میدانوں کے جلوے ہیں۔ بہار کی فصل میں مسرور پرندے جشن
آراستہ کریں گے۔ کسانوں کی گاڑیاں کھڑکھڑائیں گی ----- پیر کے دن
پینٹھ کا میلہ لگے گا۔ شرابی کسان جمع ہوں گے ----- اور اس کے علاوہ
اور کوئی نئی بات نہ ہوگی۔

سورج منزل بمنزل کاشانہ مغرب کی طرف بڑھ رہا تھا۔ قریب کے جنگل میں پھر کوئل کی آواز گونج اٹھی۔ اس کے لہجہ میں کتنا سوز تھا! ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ چیخ چیخ کر دنیا کے اسی فرسودہ اور غیر تغیر پذیر نظام کے خلاف احتجاج کر رہی ہو اور کہہ رہی ہو ——— "دنیا میں ——— دنیا کی باتوں میں کچھ بھی تو تنوع نہیں۔ وہی باتیں جو آج سے ایک صدی پہلے ہو رہی تھیں، آج بھی اسی نہج پر سر انجام پا رہی ہیں"۔

"اب میں انہی جنگلوں اور مرغزاروں میں آ کر دن گزارا کروں گا"۔ نکولس گاؤں کی طرف لوٹتے ہوئے سوچنے لگا۔ "انہی ندی نالوں کے کنارے شکار سے دل بہلاتا رہوں گا"۔

سورج کی واپسیں کرنیں بستی کے مکانوں کے در و دیوار پر اٹھکھیلیاں کر رہی تھیں۔ گاؤں کے سامنے کھیلتے ہوئے بچے شور مچا رہے تھے۔ قریب ہی مائیں اپنے آنگنوں میں بیٹھی اپنے نونہالوں کو بہلا رہی تھیں۔

نکولس چلتے چلتے ان مانوس مکانوں اور گلیوں کو دیکھتا جاتا تھا۔ اسے وہ گھر، وہ گلیاں، وہ میدان اور وہ تالاب ایسے مانوس و آشنا محسوس ہو رہے تھے جیسے وہ کبھی ان سے جدا نہ رہا ہو۔

"تسلیم۔ بھیا!" اسی وقت عقب سے کسی کی آواز سنائی پڑی نکولس نے

مڑ کر دیکھا۔ اس کا ہم عمر ایک نوجوان ٹوپی اتار کر سلام کر رہا تھا۔

"اوہو۔ تم ہو گودریلو۔"

"ہاں ——— کہو بھائی۔ کبھی ہمیں بھی یاد کیا کرتے ہو؟" گودریلو نے کہا۔

"کیوں نہیں۔"

"ہم بچپن میں اکٹھے کھیلا اور لڑا کرتے تھے نا۔"

"اچھا تو کیسے مزاج ہیں تمہارے؟"

"بہت عیش میں ہوں۔ گودریلو نے کہا۔" آج کل میں یہاں ایک ریسٹوران میں ملازم ہوں۔ آٹھ روبل ملتے ہیں۔ بس اور کیا چاہیئے۔ کہو تم کن حالوں میں ہو۔ تعلیم ختم کر چکے ہو یا اب بھی یونہی زندگی برباد کر رہے ہو۔"

"دو سال کے لئے میرا سلسلۂ تعلیم منقطع ہو گیا تھا۔"

"کیوں؟" گودریلو نے رسمی لہجے میں پوچھا

نکولس نے اپنی تعلیم کے انقطاع کی تفصیل بتانا چاہی لیکن پھر اپنے دوست کی بے پروائی دیکھ کر خاموشی کو ترجیح دی اور اجازت مانگی۔

"اچھا بھائی نکولس!" گودریلو نے کہا۔ "کبھی غریب خانہ پر آنے کا کرم بھی کرنا۔ ضرور آنا۔ کافی اچھی صحبت رہتی ہے وہاں۔ شراب نفیس سے

نفیس موجود رہتی ہے اور بلیرڈ بھی کھیلا جا سکتا ہے۔"

اسی وقت سڑک کی دوسری روش پر جاتے ہوئے ایک شخص کو دیکھ کر گودریلو نے ٹوپی اتار کر سلام کیا اور نکولس سے کہا "یہ ہمارے محاسب ہیں۔ ان کا نام 'ایوان پیٹرووچ' ہے۔ بڑے بھلے آدمی ہیں۔"

نکولس نے اس شخص کی طرف دیکھا اور گودریلو سے دریافت کیا۔

"یہ وہی کیلیاجن تو نہیں ہے؟"

"ہاں ہاں وہی ہے" گودریلو نے مسکرا کر کہا۔

کیلیاجن پٹڑی پر اس طرح چل رہا تھا جیسے سالوں کا تھکا ماندہ ہو۔ نکولس کیلیاجن کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ جس وقت نکولس سکول میں کسی نچلی جماعت میں پڑھتا تھا، کیلیاجن کسی اعلےٰ جماعت کا طالب علم تھا۔ سکول کے سب لڑکے اس کی ذہانت اور ہوشیاری کے قائل تھے اور اس کی عزت کرتے تھے۔ نکولس بھی ان دنوں کیلیاجن کو مسرور ترین اور لائق ترین آدمی سمجھتا تھا وہ نکولس کو طرح طرح کی کتابیں دیتا رہتا تھا اور کہا کرتا تھا۔ کہ اس کا ارادہ کسی مذہبی مشن کے لئے زندگی وقف کر دینے کا ہے۔ لیکن آج اسی کیلیاجن کو ایک معمولی آدمی دیکھ کر اسے بڑا تعجب ہوا۔ وہ دھاری دار پاجامہ پہنے ہوئے تھا اور پہلے کی نسبت جسیم اور صحت مند نظر آتا تھا۔ اس کے کندھے بہت چوڑے ہو گئے

تھے۔ اس کی آنکھوں میں ایک طرح کی چمک آگئی تھی۔ اس کی چال ڈھال سے قناعت اور سکون کا اظہار ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ شخص اپنی زندگی کی تمام ضرورتوں اور تمناؤں کو پا چکا ہو اور اسے کسی چیز کے لئے شور مچانے کی ضرورت نہ رہی ہو۔

"ایوان ہیٹبرو وچ!" نکولس چلایا۔

کیلیا جن نے مڑکر دیکھا اور مسکرا دیا لیکن قریب نہ آیا۔ وہیں کھڑا کھڑا نکولس کا انتظار کرتا رہا۔

گوورلیو سے رخصت ہو کر نکولس کیلیا جن کے پاس گیا اور اس سے مصافحہ کیا۔

"خوب۔ آگئے نا!"

"جی ہاں۔"

"آج کل کس مضمون کی طرف توجہ ہے۔ کیا سائنس کا مطالعہ رہتا ہے۔"

"سائنس؟ اجی نہیں۔ سائنس مجھے راس نہیں آتی۔"

"کیوں؟"

"سائینس ایک ایسا مضمون ہے۔ جو سکون کی حالت میں ہی مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور میں تو ــــــــ"

"بڑے منطقی ہو میاں - بالکل میری بیوی کی طرح"۔ کیلیا جن نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا اور پھر اپنے مذاق پر خود ہی قہقہہ لگایا۔

نکولس نے اپنی تعلیم میں رخنہ پڑ جانے کا سارا قصہ سنایا۔

"میں تو کہتا ہوں بھائی اس جھگڑے سے کچھ حاصل نہیں ہے" کیلیا جن کہنے لگا۔" اب اس سے کچھ بھی نہیں مل سکتا۔ ہمارے نوجوان بے کار زندگی گنوا رہے ہیں۔ آخر تم لوگ امیروں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہو۔ تم ان کی اصلاح تو نہ کر سکو گے۔ وہ سب کے سب جاہل اور احمق ہیں۔ بس اپنا پیٹ بھرنے شرابیں پینے اور خوب سونے کے علاوہ ان لوگوں کو اور کوئی کام نہیں ہے"۔

کیلیا جن کو امیروں سے بڑی چڑ تھی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ ان لوگوں کے لئے ایک پھٹے ہوئے جوتے کی قربانی کرنا بھی مناسب نہیں ہے۔

"میرے دوست"۔ اس نے کہا۔" میں ان لوگوں کو سدھارنے کے لئے بہت کچھ قربانیاں کر کے دیکھ چکا ہوں۔ لیکن اب اس حماقت پر پشیمان ہوں۔ دیکھو نا۔ جبکہ میرے ہم سبق بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ میں ایک معمولی کلرک ہوں۔ آج کل مقامی آبکاری کے دفتر میں کام کرتا ہوں۔ وہ دیکھو! وہ جو سرخ عمارت نظر آ رہی ہے

وہی ہمارا دفتر ہے۔ اچھا اب اجازت چاہتا ہوں۔ پھر کبھی ملنا۔"
دونو ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔

شام کے سائے گہرے ہوئے جا رہے تھے۔ چوپائے چراگاہوں سے لوٹ رہے تھے۔ اچانک گاؤں کی خاموش اور پرسکون فضا ایک شور و شغب سے گونج اٹھی۔ گائیں بیل ڈکرانے لگے۔ کہیں بچھڑے کلیلیں کر رہے تھے اور کہیں بھیڑوں کی مَیں مَیں سنائی دے رہی تھی۔ عورتیں چلّا چلّا کر مرغیوں کو پکار رہی تھیں۔ گوالے چیخ چیخ کر گوئیں ہانک رہے تھے۔ کبھی کبھی گاڑیوں کے چابک کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔
لمحہ بھر میں ساری فضا دھول سے اٹ گئی۔

غروب ہوتے ہوئے سورج کی پھیکی شعاعوں سے منوّر ہوتا آسمان سنہرا اور نہایت دلکش دکھائی دے رہا تھا۔ دیہات کی سادہ زندگی کی یہ مشغول ترین اور مسرور ترین گھڑیاں تھیں۔

۴

ایک ہفتہ گزر گیا۔

ایک دن مقامی پولیس نے سٹیفن کو بلا بھیجا۔ انہوں نے اس کا بیان لیا اور ہدایت کی کہ نکولس کو بھی کسی دن کوتوالی بھیجیں تاکہ کچھ ضروری کاغذات پر دستخط کرا لئے جائیں۔ سٹیفن پولیس کے داروغہ سے بھی جاکر ملا۔ داروغہ ایک قابل عزت شخص تھا۔ اس کا مزاج بہت اچھا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ اس کی شبیہ جنرل ڈریگومراف سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔ خود داروغہ کو اس مماثلت پر بہت فخر تھا۔

بوڑھا داروغہ سٹیفن کا دوست تھا۔ نکولس کو وہ اپنا منہ بولا بیٹا سمجھتا تھا۔ اس دن نکولس کے متعلق اس نے سٹیفن سے کیا کہا۔ یہ تو کسی کو معلوم نہیں۔ البتہ اس دن کے بعد سے سٹیفن اپنے بیٹے سے بہت اچھی طرح پیش آنے لگا۔ صرف کبھی کبھی وہ نکولس سے کہا کرتا تھا۔ "میری مانو تو تمہیں سب سے ملتے جلتے رہنا چاہیئے اور نہایت دانشمندی سے کام لینا چاہیئے۔ تم اپنے منہ بولے باپ کے گھر بھی کیوں نہیں جاتے

ہ کوئی اچھی بات نہیں کہ ـــــــ"

"اچھا۔ اچھا میں ان کے پاس جاؤں گا۔" نکولس نے قطع کلام کر کے کہا۔" لیکن باوجود کئی بار بلاوا آنے کے نہ تو وہ دارونہ کے ہاں گیا اور نہ کوتوالی ہی۔ اب نکولس تنہائی کو زیادہ پسند کرتا اسلئے کندھے پر بندوق رکھے وہ دن بھر جنگل اور چراگاہوں میں گھومتا رہتا۔"

ایک دن شام کے وقت نکولس گھر لوٹا تو میاں بیوی باغیچے میں ایک جھاڑی کے پاس بیٹھے تھے۔ قریب ہی چائے کا پانی ابل رہا تھا۔ میریا اپنے خاوند کے موزے سی رہی تھی۔ بوڑھے کے چہرے سے کبیدگی کے آثار نمایاں تھے۔ میریا بھی قدرے ہراساں سی نظر آرہی تھی۔ شاید نکولس کے متعلق ہی گفتگو کرتے کرتے دونوں میں جھڑپ ہو گئی تھی۔

ماں نے چائے کی پیالی نکولس کو پیش کی اور محبت بھرے لہجے میں پوچھا "کہاں گئے تھے بیٹا؟"

"یونہی چہل قدمی کرنے۔" نکولس نے جواب دیا اور پاس کی جھاڑی پر اپنی ٹوپی پٹک دی۔ تب وہ میز کے سامنے بیٹھ گیا اور چائے پینے لگا۔

"کیا مذاق بنایا ہے؟" سٹیفن نے تلخ ہو کر کہا۔ اس کی نگاہیں اخبار پر جھکی ہوئی تھیں۔

نکولس کا چہرہ کچھ سُرخ ہو گیا۔ لیکن اس نے ضبط کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ وہ خاموش رہا۔ کافی دیر تک کوئی بات نہ ہوئی۔ صرف کبھی کبھی میریا کوئی انٹ شنٹ بات کہہ کر اس سکوت کو توڑنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ "میرا خیال ہے" بڑھیا یونہی کہنے لگتی تھی "آج بارش کا تو کچھ احتمال نہیں ہے۔"

"آج کونوالی سے ایک نوٹس آیا ہے" بہت دیر بعد سٹیفن نے اخبار الگ رکھ کر کہا "میں نے تم سے بارہا کہا ہے۔ کہ جاؤ۔ لیکن تم تو کان ہی نہیں دھرتے۔ آخر مجھے کس جھنجھٹ میں پھنسانے والے ہو بھئی؟"

نکولس نے اپنے والد کو سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ نوٹس سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور پولیس کی طرف سے ایسا طلبانہ آنا کوئی غیر متوقع چیز نہیں ہے۔ لیکن بوڑھے کی عقل نے کوئی عذر قبول نہ کیا۔ بلکہ وہ اور بھی بگڑ کھڑا ہوا اور کہنے لگا "مجھے کیا پڑھاتے ہو۔ کیا میں خود نہیں سمجھتا۔ آج گاؤں بھر مجھ پر انگلیاں اٹھاتا ہے اور تم اپنی ہی ہانکے جاتے ہو۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ تم داروغہ صاحب کے پاس کیوں نہیں جاتے۔ اس طرح عیاری سے کام لیکر تم مجھے رسوا کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے۔"

"واہ آج تو ضرور کوئی مال بنا ہے۔" اسی وقت احاطہ کی چار دیواری کی اوٹ سے ایک مانوس آواز سنائی دی سٹیفن کے لنگوٹیے دوست وہی محرّر تھے۔

"کیا چائے پانی ہو رہا ہے؟" محرّر نے پوچھا۔

"آیئے۔ آیئے۔" میریا نے مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ایسے موقعہ پر محرر کی آمد اسے کھٹکی نہیں بلکہ وہ خوش ہوئی کہ اس کے آنے سے بات بڑھتے بڑھتے ایکا ایکی رک گئی۔

پھاٹک کھلنے کی آواز سنائی دی اور ایک پستہ قد شخص باغیچہ میں داخل ہوا۔ اس کے سر پر پھوس کی ٹوپی تھی اور وہ اپنی چال ڈھال وضع قطع اور بات چیت سے بالکل ناٹک کا کوئی مسخرا معلوم ہوتا تھا۔

دعا سلام کے بعد سٹیفن نے اپنے بیٹے کا تعارف کرایا۔

"اوہو! اشنترا کی صاحب! آپ سے مل کر تو مجھے بے پناہ خوشی ہوئی ہے۔ دور سے آپ کی زیارت کی سعادت تو مجھے پہلے بھی نصیب ہو چکی ہے لیکن قریب سے نیاز حاصل کرنے کا موقعہ آج ہی حاصل ہوا ہے۔" تب دونو بوڑھے بغاوت اور سیاسی انتشار کے متعلق گفتگو کرنے لگے۔ محرّر انگلستان کا زبردست مخالف تھا۔ انگریزوں کی ہر چال سے اسے سیاسی عیاری اور دجل و فریب کی بو آتی تھی۔ اگرچہ وہ اپنے

خیالات کو صاف الفاظ میں ظاہر نہ کر سکتا تھا تاہم اس کا عقیدہ تھا کہ نوجوانوں کو اکسانے میں غیر ملکی سازشیوں کا ہاتھ ہے لیکن سٹیفن اس بات کو بے بنیاد سمجھتا تھا۔ اور محرر کو فراست کا پتلا سمجھتے ہوئے بھی وہ اس کے اس نظریہ کا قائل نہ ہو سکا تھا۔

"میں نہیں سمجھتا کہ بیرونی لوگ کس طرح ہمارے ملک پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔" سٹیفن نے کہا۔

"اجی جناب یہ غیر ملکی لوگ بڑے حضرت ہیں۔" محرر نے حقارت آمیز لہجہ میں کہا۔ "یہ تمام ہل چل یہودیوں کی وساطت سے مچائی جا رہی ہے۔ یقین کیجیے۔ یہ غیر ملکیوں کے ہتھکنڈے ہیں۔"

"ممکن ہے بھائی!" سٹیفن نے سر ڈالتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ تو کہو۔ اب میری حالت کیسے سدھر سکتی ہے؟"

"واہ اس کا تو بہت آسان سا نسخہ ہے۔" محرر بولا۔ "داروغہ تمہارے بیٹے کا منہ بولا باپ ہے نا۔ وہ چاہے تو کیا نہیں کر سکتا جنرل ڈیگومرات جیسی عظیم المرتبت ہستی کا وہ رشتہ دار ہے۔ اس کے لئے کیا غیر ممکن ہے!"

"وہ ڈیگومرات کا رشتہ دار نہیں ہے۔" سٹیفن بولا۔ "صرف دونو کے چہروں میں مشابہت ہے۔"

"اجی نہیں۔" محرر نے اپنی بات رکھنے کے لئے کہا۔ "مجھے خوب

معلوم ہے کہ وہ جنرل کا قریبی رشتہ دار ہے ۔ میں کہتا ہوں نکولس کو داروغہ کے پاس ضرور بھیجو اور خود تم بھی جاؤ ۔"

"ارے بھئی ۔ میں تو پہلے ہی اس کے یہاں ہو آیا ہوں اور ان حضرت سے بھی سینکڑوں بار کہہ چکا ہوں کہ اپنے منہ بولے باپ سے جاکر ملو ۔ لیکن ان کا دماغ ہی خیر سے چوتھے آسمان پر ہے ۔"

سٹیفن اپنے لڑکے کی بے نیازی دیکھ کر بہت چراغ پا ہوتا تھا ۔ کبھی کبھی یہ اشتعال اتنی بھیانک صورت اختیار کر لیتا تھا ۔ کہ میریاؤ نکولس دونوں ہراساں ہو جاتے تھے ۔ اس وقت انہیں اس بات کا اندیشہ ستایا کرتا تھا کہ کہیں باتوں ہی باتوں میں معاملہ بگڑ نہ جائے ۔ آج بھی سٹیفن بہت اشتعال میں آ رہا تھا ۔ اس نے اپنے ہاتھ باہر نکال لئے اور زور زور سے چلانے لگا " او ۔ میں کتنا بوڑھا ہو گیا ہوں دیکھئے نا ۔ میرے ہاتھ اب کتنے کانپنے لگے ہیں " ۔ واقعی بوڑھے کے ہاتھ ایسے کانپ رہے تھے ۔ جیسے جاڑے کا بخار چڑھ رہا ہو ۔

" دیکھتے ہو " ؟ سٹیفن اپنے بیٹے کی طرف مڑا ۔ لیکن نکولس پہلے ہی کھسک گیا تھا ۔ گفتگو کا ڈگر بدلتے دیکھ کر وہ چپکے سے باغیچے کے باہر چلا گیا ۔

اس دن نکولس بہت رات گئے تک گھر نہ لوٹا ۔ اس کے دل میں

گھر جانے کی خواہش ہی نہ پیدا ہوتی تھی۔ بہت دیر تک اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد وہ ایک مکان کے سامنے رُک گیا اور اس کی کھڑکی پر دستک دی۔ دیوار کی ایک درار سے دھیمی دھیمی روشنی چھن رہی تھی۔ نکولس نے پکارا

"گوورلیو!"

دروازہ کھلا اور ایک اونگھتے ہوئے آدمی نے باہر جھانک کر دیکھا

"گوورلیو! میں اندر آنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور۔ ضرور!!" وہ شخص بولا۔

"اور کچھ شراب بھی ——"

"واہ۔ یہ تو تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔" یہ کہہ کر گوورلیو نے میز پر ایک بوتل لا رکھی۔

نکولس بہت دیر تک اس ہوٹل کے کمرے میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس کا سر ہتھیلیوں پر لٹکا ہوا تھا۔ سامنے وہی شراب کی بوتل دھری تھی۔ بار بار اس کے دماغ میں ایک خیال جاگ اٹھتا تھا۔ "اب مجھے کیا کرنا چاہیئے۔" جوں جوں وہ خیال گہرا اور واضح تر ہوتا جاتا تھا۔ حزن و یاس اس پر مستولی ہوتے جاتے تھے۔ ہوٹل کے اس مکمل سکوت کے عالم میں وہ بار بار گنگنا رہا تھا۔

دل رہینِ غم جہاں ہے آج

ہر نفس تشنۂ فغاں ہے آج
سخت ویراں ہے محفلِ ہستی
اے غمِ دوست تو کہاں ہے آج

"گو دریلو! ایک بوتل اور"
بوتل آگئی اور نکولس پھر دادِ مے کشی دینے لگا۔

سخت ویراں ہے محفلِ ہستی
اے غمِ دوست تو کہاں ہے آج

لیکن اچانک۔ نہ جانے کیوں۔ اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوگیا۔ اس کے تصوّر کی پہنائیوں میں بے شمار یادیں ہجوم کر آئیں۔ جوں جوں وہ یادیں زیادہ واضح ہوتی گئیں اس کے دل کی کسک بھی مٹتی گئی۔ وہ اپنے گھر کو بھی بھلا بیٹھا۔ اب اسے ہوٹل کا گندہ فرش نظر آتا تھا اور نہ وہ کالی کالی دیواریں۔ پاس کے کمرے سے جو بیرڈ کھیلنے کی آواز آرہی تھی وہ بھی بند ہوچکی تھی۔ نکولس اپنے خیالات میں محو ہوگیا۔ جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ اچانک اسے تصوّر ہی تصوّر میں کیف کی وہی پُر ہجوم سڑکیں اور بجلی کی روشنی سے بقعۂ نور بنی ہوئی دکانیں نظر آنے لگیں۔ پھر وہی شور نغمہ سنائی دینے لگا —— وہی

ہل چل —— وہی ——

نکولس کا چہرہ ان تصوّرات کے پرتو سے جگمگا اُٹھا اور وہ مسکراتا ہوا پاس کھڑے نیم مدہوش گودریلو سے پوچھنے لگا۔

"کہو دوست کبھی کیف گئے ہو؟"

"نہیں" گودریلو نے چونک کر جواب دیا۔" وہاں ایسے ہوٹل تو سینکڑوں ہوں گے"

نکولس کھلکھلا کر ہنس دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا دوست شکریہ"۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی ٹوپی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔

رات بہت کافی گزر چکی تھی۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے رات چاندنی کی ردا اوڑھ کر خود بھی سو گئی ہو۔ گاؤں کے گھنٹہ گھر میں ٹن ٹن کی آواز گونج اٹھی۔ اس کی آواز کتنی سوزناک تھی۔ یہ آواز بہت دیر تک فضا میں ارتعاش پیدا کرتی ہوئی گونجتی رہی اور پھر چاندنی کی خاموش کرنوں سے ٹکرا کر خود بھی خاموش ہو گئی۔

نکولس آہستہ آہستہ اپنے گھر کی جانب لوٹ رہا تھا۔ سڑک کی پٹڑیوں پر اس کے جوتے کی آواز گونج اٹھتی تھی۔ چلتے چلتے وہ ایک جگہ رک گیا

اور نظریں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ تارے ٹمٹمار ہے تھے۔ اچانک اسے فرانس کا مشہور انقلابی نغمہ "مارسیلز" یاد آگیا اور وہ چلا چلا کر گانے لگا۔

خواجہ از خون رگ مزدور سازد لعل ناب
وز جفائے دہ خدایاں کشت دہقاں خراب
انقلاب! انقلاب اے انقلاب!!

لیکن یکایک پاس کی کسی دکان سے ایک کتا بھونک اٹھا اور نکولس کو گانا بند کرنا پڑا۔ سڑک پر سناٹا چھا گیا تھا۔ صرف اس کے چلنے کی آہٹ تھی جو اس وقت محوِ خیال رات کے سکون میں مخل ہو رہی تھی۔

۵

اس دن بہت رات گزر جانے پر بھی نکولس کی آنکھ نہ لگی۔ وہ گھنٹوں تک دیوان خانے میں صوفے پر پڑا رہا۔ اس کے دماغ میں بے شمار یادیں کلبلانے لگیں۔ اسے اپنا زمانہ طالب علمی یاد آنے لگا۔ کیف میں گزرے ہوئے وہ ایام کتنے ہنگامہ ساماں تھے۔ بار بار یہ تصویر اس کے تصورات کی سطح پر ابھر آتی رہی۔ لیکن ان یادوں میں بھی ایک یاد اسے خاص طور پر بے چین کرنے لگی۔ اس واقعہ کو یاد کر کے وہ مسرور بھی ہوا اور حزیں بھی۔ وہ یاد اسے بے چین کر رہی تھی۔ لیکن وہ اسے اپنے حافظہ سے محو کر دینے پر قادر نہ تھا اور شاید وہ یہ چاہتا بھی نہ تھا۔

ان دنوں وہ کیف کے قید خانے میں تھا۔ دن پہاڑ کی طرح کٹتے تھے۔ ایک دن ایک سال معلوم ہوتا تھا۔ کسی کی آواز سنائی پڑتی تھی اور نہ کسی کی صورت دکھائی دے جانے کا امکان تھا۔ رات دن وہی کال کوٹھڑی اور اس کی بھدّی اور کریہہ المنظر دیواریں ——— اسے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اسے جیتے جی گوشۂ قبر میں دفنا دیا گیا ہو۔

یکایک ایک دن کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور داروغہ جیل داخل ہُوا۔ اس کے ساتھ ایک سنتری بھی تھا۔ جو پوری طرح مسلح تھا ——— کمر میں تلوار لٹک رہی تھی اور بغل میں پستول۔

"کوئی صاحب آپ سے ملاقات کی غرض سے آئے ہیں" داروغہ بولا۔

نکولس نے اپنی ٹوپی پہنی اور بھاری کوٹ کندھے پر ڈال لیا۔ داروغہ چلا گیا تھا لیکن وہ سنتری ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ نکولس اسکے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ان کا راستہ ایک تنگ و تاریک گیلری میں سے ہو کر نکلتا تھا۔ دونو طرف قیدیوں کی کوٹھڑیاں تھیں۔ دروازہ پر سلسلہ وار نمبر لگے ہوئے تھے۔ ہر پنجرے میں ایک ایک آدمی اس طرح بند تھا جیسے چڑیا گھر میں جانور۔

"کون آیا ہوگا؟" نکولس سوچنے لگا۔ "کیا امّی؟" لیکن اسے تو میرے قید ہو جانے کی ابھی اطلاع بھی نہ ملی ہوگی۔ تب کون ہو سکتا ہے؟ میرے ہم سبقوں کا آنا بھی ممکن نہیں ہے۔ وہ یا تو قید ہو چکے ہیں یا ملک بدر کر دئے گئے ہیں اور کوئی بچ بھی گیا ہوگا تو اسے یہاں کون آنے دے گا۔"

"کیوں بھائی! کون آیا ہے؟" نکولس نے سنتری سے پوچھا۔

"صاحب۔ ہمیں قیدیوں سے بات چیت کرنے کی اجازت نہیں"

اس نے جواب دیا۔

" لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو مغالطہ ہُوا ہے۔ وہ شخص کسی اور سے ملنے آیا ہوگا۔"

سنتری نے چاروں طرف احتیاطاً دیکھا۔ پھر آہستگی سے کہا۔

" اجی آپ ہی کی اہلیہ محترمہ تشریف لائی ہیں۔"

" اہلیہ !" نکولس چونک پڑا۔ اس کے قدم چلتے چلتے رُک گئے اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ خوب ہنسے، دل کھول کر ہنسے۔

" چلیئے۔ رُک کیوں گئے آپ ؟" سنتری نے متعجب ہو کر کہا۔

لیکن نکولس کے دل میں تو طوفان بپا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ صرف نہایت قریبی رشتہ دار ہی جیل میں ملنے کے لئے آسکتے ہیں۔ اس لئے کسی کی محبوبہ کا آنا تو ممکن نہیں۔ لیکن اس کے پاس آنے والا کون ہو سکتا ہے ؟

انہوں نے میری منگنی تو نہیں کر دی ؟ اچانک اسے خیال پیدا ہُوا اور اس کا دل اور بھی زوروں سے دھڑکنے لگا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ بلا قصد مسکرا دیا۔

" لیکن وہ کون ہو گی۔ جس سے میری نسبت ہوئی ہے۔" پھر وہ

آپ ہی آپ پوچھنے لگا۔ اس کے دل میں ایک عجیب کھلبلی مچ رہی تھی۔
"بیوی!" وہ پھر سوچنے لگا۔ اس لفظ میں کتنا سرور بھرا ہے کتنی مسرّت، کتنا انبہاج ——— لیکن وہ ہے کون؟"
وہ نیزی سے سنتری کے آگے آگے چلنے لگا۔ وہ جلد ہی ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچ گئے۔ سامنے ایک دوسرا کمرہ تھا۔ وہ بھی ایسا ہی تھا اور میلا تھا۔ لیکن دونو کمروں کے درمیان کوئی دروازہ نہیں تھا بلکہ صرف ایک کھڑکی تھی۔ جس میں شیشوں کی جگہ پیتل کی جالی لگی ہوئی تھی۔ نکولس نے اس کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ زعفرانی کپڑوں میں ملبوس ایک حسین اور نوخیز لڑکی کھڑی تھی۔
"تسلیم"۔ وہ مسکرا کر بولی۔
پاس ہی ایک پولیس کا افسر کھڑا تھا۔ جب وہ اپنا پاؤں ہلاتا اس کا "چار آئینہ" کھنک اٹھتا تھا۔
"تسلیم"۔ نکولس نے جواب دیا اور دونو ایک دوسرے کی طرف تاکنے لگے۔
"آپ کچھ اداس نظر آتے ہیں"۔ لڑکی نے پوچھا۔
"نہیں تو" نکولس نے جواب دیا۔ لیکن وہ متحیّر ہو رہا تھا۔ بار بار وہ سوچ رہا تھا کیا میں نے اسے کہیں دیکھا ہے؟ لیکن وہ کسی نتیجے پر

نہ پہنچ سکا۔ وجہ یہ تھی کہ لڑکی کے چہرے پر ہلکے لاجوردی رنگ کا گھونگٹ پڑا تھا۔ اس کے علاوہ جالی کی اوٹ سے بالکل صاف نظر آنا بھی مشکل تھا
"اگر آپ اپنا گھونگٹ کھول سکیں ———" نکولس نے شرماتے ہوئے ملتجیانہ لہجہ میں کہا۔
"ضرور ———" اتنا کہہ کر لڑکی نے اپنی نقاب اٹھا دی۔ وہ سحر بھری آنکھیں نکولس کی طرف دیکھ کر چمک اٹھیں۔ وہ لجا سا گیا اور اس کے رخساروں پر سُرخی سی دوڑ گئی۔
"اوہ کتنا دل نواز مکھڑا ہے"۔ نکولس نے اپنے دل میں سوچا۔ "اتنا حسین چہرہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"
اسی وقت پاس کھڑا ہوا پولیس افسر چوکنا ہو کر دیکھنے لگا۔ وہ بار بار کھانستا تھا اور اپنے اسلحہ کو کھنکھنانے لگتا تھا۔ گویا یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اسے ہر بات اچھی طرح سنائی دے رہی ہے۔
"آپ اپنی گولیا کو تو بھول ہی گئے"۔ وہ پھر بولی۔
"نہیں"۔ نکولس نے اٹکتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرا اٹھا۔ لیکن اس کی نگاہیں ابھی تک جھکی ہوئی تھیں۔
لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ہنستے وقت اس کے دانت موتیوں کی طرح چمکنے لگے اور آنکھیں کسی غیر ارضی مسرت سے تمتما اٹھیں۔

پھر پولیس افسر کی کھن کھن سنائی دی۔

"ازراہِ نوازش اتنا شور نہ کیجئے۔" وہ بولا۔

"واہ صاحب! یہ آپ نے خوب کہی۔ کیا یہاں ہنسنے کی بھی اجازت نہیں؟" لڑکی نے شوخی سے پوچھا۔

"جی نہیں۔ بآواز ہنسنے کی اجازت نہیں۔"

"اور رونے کی ——— ؟"

"یہاں نہ ہنسنے کی اجازت ہے اور نہ رونے کی۔" پولیس افسر نے جواب دیا۔

جب دونوں خاموش ہو گئے تو نکولس نے پھر لڑکی کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا: "آج کل باہر موسم تو خوب خوشگوار ہو گا۔"

"جی ہاں۔ آج کل پھولوں پر ایسی بہار ہے کہ فضا مہکتی رہتی ہے۔" وہ کہنے لگی۔ "اور تارے بھی اتنے صاف چمکتے ہیں اور اتنے بڑے نظر آتے ہیں جیسے یہ زمین کے قریب آ گئے ہوں۔ اگلی دفعہ جب میں آؤں گی آپ کے لئے کچھ پھول لاؤں گی۔ کہئے کونسا پھول آپ کو سب سے زیادہ پسند ہے؟"

"جونسا بھی آپ لے آئیں۔" نکولس لجاتا ہوا بولا۔ "میں انہیں اپنی کوٹھڑی میں رکھوں گا اور وہ مجھے آپ کی یاد دلاتے رہیں گے۔" اس نے

لڑکی کی طرف دیکھا اور پھر آنکھوں سے آنکھیں مل گئیں۔ وہ شرما گیا اور اسکے رخساروں پر سرخی جھلکنے لگی۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں ہفتے کے ہفتے آپ سے ملنے آیا کروں گی"۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھیں نیچی کر لیں۔ اس وقت جیل کی گھڑی نے ٹن ٹن دو بجائے۔

سنتری نے دروازہ کھولا اور کہا "چلیئے وقت ختم ہو گیا ہے"۔

"اچھا۔ تسلیم" گولیا نے مہر بھری نظروں سے دیکھ کر کہا "غم نہ کیجیئے۔ جہاں بھی رہیئے۔ خیال رکھیئے کہ آپ وفا فراموشگار ثابت نہ ہوں"۔ نکولس جواب میں فقط مسکرا دیا۔ لیکن اس کے تبسم میں ایک سوز پنہاں تھا۔ آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ دل اچھلا پڑتا تھا۔ اچانک اس کے دل میں مسرت کا ایسا طوفان امڈ آیا کہ اسے جی بھر کر رونے کی خواہش ہوئی۔

دروازہ بند ہو گیا۔ پھر وہی کال کوٹھڑی۔ وہی سناٹا۔ یکایک نکولس کے دل میں گانے کی خواہش کروٹیں لینے لگی اور وہ اونچے سُروں میں کسی پرانے رُوسی گیت کی تانیں الاپنے لگا۔ گیت کا پہلا بول تھا۔

سجنی پیار کروں گا تجھ سے، ساتھ چلوں گا تیرے۔

"یہاں ناچنے گانے کی اجازت نہیں" اچانک کسی کی کرخت آواز سنائی

دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دروازہ ہی انسانی زبان سے بول اٹھا ہو "اور محبت کرنے کی ؟" نکولس نے گانا بند کرکے پوچھا۔

کوئی جواب نہ ملا۔

اس دن نکولس کے دل میں مسرت کی لہریں اتنے زور سے اٹھنے لگیں کہ کچھ دیر کے لئے وہ اپنی پابندیوں کو بھول سا گیا اور خوشی کے مارے دن بھر بچوں کی طرح اچھلتا کودتا رہا۔ کبھی وہ جانوروں کی طرح سر اٹھا کر کوٹھری میں دوڑنے لگتا تھا۔ کبھی مٹھیاں بھینچ کر دیواروں کی طرف لپکنے لگتا تھا۔ ایک دفعہ تو اس نے اچھل اچھل کر ناچنے کی بھی کوشش کی۔

"واہ! یہ تو ایسے ادھم مچا رہا ہے جیسے آج اس کی سالگرہ ہو" سنتری نے دروازہ کی دراڑ میں سے جھانک کر دل ہی دل میں کہا۔ واقعی نکولس کے دل میں آج بے پایاں مسرت کا طوفان موجزن تھا۔ اس طرح ناچتے کودتے شام ہوگئی۔ ہفتہ کا دن تھا۔ گرجا کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ ان کی سریلی آواز سے فضا گونج اٹھی۔ یکایک نکولس کے دل کا طوفان تھم گیا اور وہ طرح طرح کے تصورات میں کھو گیا۔ اسے اپنا بچپن یاد آنے لگا۔ دل میں ایک طرح کا اضطراب پیدا ہوگیا۔ اور اس کا چہرہ ملول سا ہوگیا۔ اس نے کوٹھری کی کھڑکی کھول دی۔ آسمان صاف اور نیلگوں تھا۔

سورج غروب ہو رہا تھا اور شام کی رخصت ہوتی ہوئی کرنیں جیل کے در و دیوار کو خون رنگ روشنی سے منور کر رہی تھیں۔ پاس ہی کچھ کبوتر کلیلیں کر رہے تھے۔

نکولس کھڑکی میں سے غروب آفتاب کا نظارہ کرنے لگا۔ اس کا جی اور بھی اداس ہو گیا۔ دل میں درد کی لہریں اٹھنے لگیں۔ ان آزاد فضاؤں میں پرواز کرنے والے پرندوں کو دیکھ کر اسے اپنی آزادی یاد آ گئی۔

دھند لکے گہرے ہوتے گئے۔ بہار کی سہانی رات تھی۔ کھڑکی کے سامنے سرکاری لیمپ روشنی پھیلا رہا تھا۔ قریب سے کسی کے گانے کی آواز کان میں آ رہی تھی۔

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے

آخر اس درد کی دوا کیا ہے

شاید داروغہ کے بنگلہ پر ہی کوئی گا رہا تھا۔ کبھی کبھی ایک بلبل بھی جیل کی دیوار پر بیٹھا چہچہانے لگتا تھا۔ نکولس آزردہ سا ہو گیا۔ ایک عجیب طرح کی ویرانی نامحسوس طور پر اس کے دل پر چھانے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کی خلش کا باعث کیا ہے۔ فقط ایک ہی خیال رہ رہ کر اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔

"یہ البیلی لڑکی گولیا آخر ہے کون ؟"

پورا ہفتہ وہ اسی طرح بے چین رہا۔ اگلے شنبہ گولیا کو پھر آنا تھا۔
نکولس اب اٹھتے بیٹھتے اسی ساعت کا انتظار کرنے لگا جب وہ اپنی
اجنبی محبوبہ کو دیکھ سکے گا۔ نکولس کو ہر آن آنے والے شنبہ کا دھیان رہتا
تھا۔ اسے رات کو نیند بھی نہ آتی تھی۔ ہفتہ میں ابھی کتنے دن باقی ہیں اسکا
ذہن اسی سوال کو سلجھانے میں رات دن غلطاں رہنے لگا۔

آخر وہ دن آیا۔ نکولس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس دن موسم قدرے
خراب تھا۔ مطلع ابر آلود تھا اور بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ لیکن نکولس کو
اس کی خبر تک نہ تھی۔ وہ تو اپنی کوٹھری میں اس طرح ہشیار اور مستعد بیٹھا
تھا جیسے پہرہ دے رہا ہو۔ اس کی ٹکٹکی دروازے کی طرف بندھی ہوئی
تھی۔ ذرا سا کھٹکا ہونے پر بھی وہ چونک اٹھتا تھا۔

دروازہ کھلا اور سنتری کھانا لے کر داخل ہوا۔

"کوئی ملاقاتی آیا ہے ؟" نکولس نے نہایت اشتیاق سے پوچھا۔

لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے کھانے کو ہاتھ تک نہ لگایا۔
اس کی نظریں اب بھی دروازے کی جانب جمی ہوئی تھیں۔ کان ہر آواز
کو سننے اور سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہت دیر تک وہ اسی طرح
چشم براہ اور گوش بدیوار رہا۔ آخر بے چین ہو کر اس نے کواڑ کھٹکھٹائے

اور سنتری کو پکار کر پھر پوچھا۔ "کوئی آیا؟"

لیکن اب کے بھی کوئی جواب نہ ملا۔

شام ہوگئی اور قیدی شام کی حمد کے گیت گانے لگے۔ نکولس مایوس ہوگیا۔ اب اسے گولیا کے آنے کی امید نہ رہی تھی۔ اسی وقت جیل کا داروغہ قیدیوں کی حاضری لیتا ہوا اس کی کوٹھری کے قریب آیا۔ دروازہ کھول دیا گیا اور نکولس کے سامنے کچھ پژمردہ پھول رکھ دیئے گئے۔

نکولس کے گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور ہوگیا اور کانپتی ہوئی آواز میں اس نے پوچھا۔

"اور میرا ملاقاتی؟"

لیکن اسے جواب نہ ملا۔ داروغہ مسکرایا اور چلا گیا۔ دروازہ بند ہوگیا تو نکولس نے اس کی آواز سنی۔

"یہاں تو ہر کوئی کسی نہ کسی کی محبت میں گرفتار ہے۔"

نکولس نے ان پھولوں کی پنکھڑیوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ مرجھا جانے پر بھی وہ پھول ایک بھینی بھینی خوشبو سے مایہ دار تھے۔ نکولس کو تو وہ اور بھی عزیز معلوم ہو رہے تھے۔ کیونکہ کچھ دیر پہلے وہ پھول گولیا کے ہاتھوں میں رہے ہونگے۔

نکولس ان پھولوں کو کمال احتیاط سے رکھنے لگا۔ وہ ان کی اس طرح

حفاظت کرتا تھا۔ جیسے ماں اپنے بچوں کی۔ وہ پھول زیادہ دیر شاداب
نہ رہ سکے۔ موت نے انہیں جلد ہی جھلسا دیا اور وہ سیاہ پڑ کر بوسیدہ ہو
گئے۔ صرف ایک سوکھا پھول بچ رہا۔ نکولس نے اسے ایک ڈائری
میں رکھ دیا۔ جب کبھی وہ اس ڈائری کو کھولتا تھا اس کی نظریں اس
پژمردہ پھول پر جم کر رہ جاتی تھیں۔ اور پھر وہی خیال اس کے ذہن میں
جاگ اٹھتا تھا۔

"آخر وہ حسین بھولی بھالی گولیا ہے کون؟"

۶

دوسرے دن صبح کمرے میں ایک عجیب طرح کی بھنبھناہٹ سن کر نکولس کی آنکھ کھل گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سارا گھر اس دھیمی آواز سے گونج رہا ہو۔ نکولس نے لہجہ سے پہچانا کہ یہ اس کے ابا جان کی آواز ہے۔ وہ اپنی صبح کی مناجات میں مشغول تھے۔ کبھی کبھی بوڑھے کے گھٹنوں کے چٹخنے کی آواز آتی تھی۔ اپنے متعلقین اور احباب کے لئے دعا کرنے کے بعد وہ اٹھا اور اپنا پائجامہ جھاڑتا ہوا گنگنایا۔

"اگرچہ وہ غلط راستہ پر ہے تاہم اسے اپنا ایک ادنیٰ خادم سمجھ کر معاف کر دیجئے گا۔"

دعا کے بعد سٹیفن نکولس کو جگاتا ہوا بولا۔

"اٹھو۔ آج تمہیں کوتوالی جانا ہے۔"

"اچھا۔" نکولس نے جواب دیا۔

"صرف اچھا ہی نہیں۔ جلد اٹھ کر ہاتھ منہ دھو لو اور دعا سے فارغ ہو لو۔ آج تمہیں ضرور پولیس افسر کے پاس جانا ہے۔"

بوڑھے نے پردہ ہٹا کر کھڑکی کھول دی۔ صبح کی تازہ ہوا، سورج کی کرنیں، اور پرندوں کے چہچہانے کی شیریں آوازیں ــــ بیک وقت کمرے میں آ پہنچے۔ قریب ہی میریا کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ برتن ہاتھ میں لئے ہوئی ان مرغیوں کو للکار رہی تھی جو باسنوں کی کھڑکھڑاہٹ سن کر اس کے گرد آ جمع ہوئی تھیں۔

نکولس بہت دیر تک اسی حالت میں بستر میں لیٹے لیٹے گولیا کو یاد کرتا رہا۔ وہ حسب معمول اپنی پھولدار ٹوپی اور سفید پوشاک پہن کر خواب میں آئی تھی اور اس سے سرگوشیاں کر رہی تھی لیکن اس نے کیا کہا تھا۔ یہ نکولس کو اس وقت یاد نہ آرہا تھا۔

"گولیا اٹھو"۔ میریا نے کھڑکی میں سے جھانک کر کہا۔ "آج تمہیں کوتسالی جانا ہے۔"

نکولس کا سلسلہ خیالات برہم ہوگیا۔ اس کے جسم میں ایک کپکپی دوڑ گئی اور گولیا کے بارے میں اٹھتے ہوئے خیالات اس طرح غائب ہو گئے جس طرح میریا کی آواز سن کر بکائن کی جھاڑی پر بیٹھے ہوئے پرندے چونک کر اڑ گئے تھے۔

"سنا کہ نہیں؟" وہ پھر بولی۔ "آج تمہیں پولیس کے دفتر میں جانا ہوگا۔"

"میں بہرا تو نہیں ہوں"۔ نکولس نے چڑ کر جواب دیا۔ وہ کچھ دنوں سے پولیس کا لفظ سنتے ہی مشتعل ہو جایا کرتا تھا۔ بار بار اپنے والدین کی زبان سے پولیس، داروغہ اور رمنہ بولا باپ وغیرہ الفاظ سن کر اسے غصہ آجاتا تھا۔

وہ اٹھا اور جلد جلد ہاتھ منہ دھو کر کپڑے پہننے لگا۔ بال بھی اس نے اتنی رواروی میں سنوارے کہ کئی بال کنگھے میں الجھ کر ٹوٹ گئے۔ تب وہ باہر باغیچہ میں گیا۔ جہاں چائے تیار ہو رہی تھی۔ میبریا نے چائے کی پیالی سامنے رکھی۔ وہ آج نکولس کی طرف بہت توجہ دے رہی تھی۔ اس کا کوتوالی جانا بڑھیا کے لئے بہت اہم بات تھی۔ اس کے دل میں امید و بیم کے جذبات غلط ملط ہو رہے تھے۔ وہ بار بار دل ہی دل میں نکولس کے لئے دعائیں کر رہی تھی اور اس کی طرف ایسی رحم بھری اور شفقت آمیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ کسی خطرناک مہم پر جا رہا ہو۔

شٹیفن نے اپنے بیٹے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ اس دوران میں کبھی کبھی غراتا رہا اور میز پر بکھرے ہوئے روٹی کے ٹکڑے چن چن کر اپنی طشتری میں جمع کرتا رہا۔

نکولس یہ دیکھ کر دل ہی دل میں بے چین ہونے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا والد اپنے افلاس کا مظاہرہ کر کے اسے

اپنی بے کسی کی جانب متوجہ کر رہا ہو۔ اسے یہ بات اتنی چبھی کہ اس نے
چائے کی پیالی کو ہاتھ تک نہ لگایا۔

"ذرا اپنے بال تو ٹھیک طرح سنوار لو۔" بوڑھے نے اپنے دفتر
کے لئے روانہ ہوتے ہوئے کہا۔" تمہیں نائب داروغہ سے گفتگو کرنا
ہو گی۔ خدا کے لئے ذرا خوش خلقی سے پیش آنا۔ وہ لوگ میرے دوست
ہیں۔ اپنے ترش رویئے سے میری دوستی پر حرف نہ لانا۔"

شٹیفن کے چلے جانے کے بعد بڑھیا اپنے بیٹے سے کھل کر
بات چیت کرنے لگی۔

"کل رات کہاں چلے گئے تھے بیٹا۔" ماں نے پوچھا۔" ہم لوگ
تو راہ دیکھتے دیکھتے تھک گئے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا بات ہو گئی
ہو گی۔ بلکہ ہم تو پریشانی کے عالم میں تمہیں کوتوالی بھی تلاش کر آئے"

نکولس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ اسے کچھ طیش سا آیا اور
اس نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"دن رات کوتوالی اور پولیس!" وہ چڑ کر بولا۔" کیا مجھے کھانا کھاتے
وقت بھی چین نہ ملے گا۔ تم تو مجھے پولیس کی بات سنائے بغیر چائے بھی
نہیں پینے دیتیں۔"

"لیکن کولیا! ہمیں تشویش ہونے لگتی ہے۔" بڑھیا گھبرا کر کہنے

گئی۔" تم ہماری تحویل میں ہو۔ تمہارے والد تمہارے لئے جواب دہ ہیں۔ ان پر کسی طرح کی آفت لانا ٹھیک ہوگا کیا؟"

"اچھا۔ اچھا۔ اب میں کہیں نہ جاؤں گا۔" نکولس نے اس ناخوشگوار سلسلہ گفتگو کو ختم کرنے کی نیت سے کہا۔ "اور ایسی کوئی جگہ بھی نہیں جہاں میں بھاگ کر جا سکوں۔ اسلئے آپ لوگوں کو گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"بیٹا۔ تم جانتے ہی ہو کہ حکام نے تمہارے بابا سے ذمہ داری کی تحریر لی ہے۔ تم زیادہ دیر غائب نہ رہا کرو۔"

"اچھی بات ہے۔"

"دیکھو نا۔ کل شام ہی کیلیاجن نے تمہیں بلا بھیجا تھا۔ کہتے ہیں۔ تمہارے بارے میں کوئی رپورٹ آئی ہے۔ کسی خط و کتابت کا پتہ چلا ہے"

نکولس خاموش رہا۔ تب میریا توصیف آمیز لہجے میں کیلیاجن کا تذکرہ کرنے لگی۔

"دیکھو۔ اس نے اپنی تعلیم ختم کر لی ہے۔ عہدہ بھی اچھا مل گیا ہے اور شادی بھی ہو گئی ہے۔ بہو بھی کتنی اچھی ملی ہے اسے۔" میریا نے ایک آہ بھر کر کہا اور ایک آزردہ نگاہ سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔

"مجھے بھی ایک بہو مل گئی ہے۔" نکولس نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا!" میرپا نے اس کی بات پر اعتبار نہ کیا اور پوچھا۔ "کون ہے وہ؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"واہ یہ اچھی رہی۔ اچھا یہ تو بتاؤ۔ وہ کسی امیر خاندان کی ہے یا معمولی گھرانے کی"؟

"یہ بھی مجھے معلوم نہیں۔"

"اس کا نام؟"

"کہ نہیں سکتا۔"

میرپا یہ جواب سن کر ہنسنے لگی۔

"یوں تو دنیا میں ہزاروں خوبصورت لڑکیاں ہیں۔" بڑھیا بولی "لیکن اب اس حالت میں کوئی بھی تمہیں قبول کرنے پر رضامند نہ ہوگی۔"

"ممکن ہے۔ لیکن وہ لڑکی تو خوشی مجھ سے شادی کرلے گی۔"

"تب تو وہ بہت مستقل مزاج ہوگی۔ لیکن کو لیا تم نے اپنے سکھ کے سب مواقع کھو دئے۔ اگر آج بھی تو پڑھ لکھ کر کہیں کوئی اچھا عہدہ پا لیتا تو گھر میں خوبصورت دلہن آتی اور ———"

"ماں! تم تو ہر روز رو رو کر مجھے ڈگمگا دیتی ہو۔" نکولس کھمیاں ہنستا ہوا بولا۔

"بیٹا! ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں؟ میرا دل نہیں اداس دیکھ کر کتنا بے کل رہتا ہے۔" ماں کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

"ماں! کیوں بے کار غم کرتی ہو۔ میں جو کچھ کرتا ہوں اپنے عقیدے کے مطابق ٹھیک سمجھ کر ہی کرتا ہوں۔ میں اس راستے سے منحرف نہیں ہو سکتا۔"

نکولس اٹھا اور کوتوالی کی طرف روانہ ہوگیا۔ بڑھیا پھاٹک تک اس کے ساتھ ساتھ آئی۔ جب وہ جانے لگا تو اس نے چپکے سے صلیب کا مقدس نشان بنا کر دھیمی آواز میں کہا —— "جاؤ۔ خداوند تمہارا حامی و ناصر ہو۔"

گاؤں کے گرجا گھر کے سامنے پیلے رنگ کی ایک عمارت تھی۔ اس کی چھت پر ایک بدوضع منارہ تھا۔ نیچے ایک بڑا وسیع برآمدہ تھا۔ جس میں دیہاتی مردوں عورتوں کا ہمیشہ ایک ہجوم نظر آیا کرتا تھا۔ نکولس نے وہ عمارت دیکھی تو اسے معًا اپنے والد کے لمبے لمبے خطبے اور اپنی والدہ کے آنسو نظر آنے لگے۔ اس کالی کلوٹی عمارت کو دیکھ کر اسے اپنے منہ بولے باپ کی یاد بھی آگئی اور اس کے دل میں پھر کھلبلی مچنے لگی۔

اسے وہ مکان ایسا متقتل معلوم ہونے لگا جس کا ذکر اس نے بچپن میں ایک دہشت ناک کہانی میں پڑھا تھا۔

جب نکولس اس مکان کے برآمدہ میں پہنچا۔ وہاں بیٹھے ہوئے دہقان اس کی بھڑکیلی پوشاک کو دیکھ کر تعظیم کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مردوں نے اپنی ٹوپیاں اتار لیں اور عورتوں نے سر جھکا لئے۔ ایک دہقان دھیمی آواز میں اپنے لہجے کو حسرت آگیں بناتا ہوا بول اٹھا۔ "ہے خداوندا!" اس ایک لفظ میں کتنا درد، کتنا سوز مضمر تھا۔

نکولس آگے بڑھا۔ سیڑھیوں کے آس پاس بھی دیہاتیوں کا ہجوم تھا۔ فرش پر کچھ عورتیں بیٹھی تھیں۔ قریب ہی ایک چپراسی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا عورتوں سے ٹھٹول کر رہا تھا۔ ہر طرف کچھ ایسی بو پھیلی ہوئی تھی جیسی بہت سے چوہوں کے ایک ساتھ مر جانے سے پیدا ہوتی ہے۔

نکولس نے ان لوگوں سے وہاں جمع ہونے کی وجہ پوچھی، یکایک بیسیوں آدمی یک زبان ہو کر بول اٹھے۔ "ہم گواہی دینے آئے ہیں بھیا۔"

وہ اس طرح چلا اٹھے جیسے انہیں امید تھی کہ چمکیلے بٹنوں والا یہ نوجوان ضرور ان کی کچھ دستگیری کر سکے گا۔

سیڑھیاں چڑھ کر نکولس اوپر پہنچا۔ سامنے ایک چپراسی کھڑا تھا اس نے آکر پوچھا۔ "فرمائیے۔ کیا کام ہے؟"

نکولس کا جواب پاکر چپراسی اسے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا اور اسے وہاں بٹھا کر باہر چلا گیا۔ نکولس بہت دیر بیٹھا رہا ہر چہار طرف سے مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح ہجوم کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کہیں کاغذ پھڑپھڑا رہے تھے اور کہیں تیزی سے قلمیں چل رہی تھیں۔ کبھی کبھی سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آہٹ بھی سنائی دے جاتی تھی۔

نکولس اس بھگدڑ کی آوازیں سنتے سنتے کسل اور کوفت سی محسوس کرنے لگا۔ اس کی طبیعت گراں سی ہو گئی اور اسے نیند سی آنے لگی۔ ہوتے ہوتے اس کے تمام جسم میں ایسی سنسنی دوڑ گئی جیسے اسکے تمام اعضا و جوارح ماؤف ہو گئے ہوں۔ اس کی پیشانی ٹھنڈی پڑ گئی، خیالات دھندلے ہو کر منتشر ہو گئے اور گویائی گویا سلب ہو گئی۔

بہت دیر تک نکولس اسی نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا رہا۔ پھر اسے کسی کی آواز سنائی دی ——— "چلئے"۔

نکولس نے آنکھیں کھولیں۔ وہی چپراسی اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ نکولس اٹھ کھڑا ہوا لیکن جلد جلد

آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا اور ایک پاؤں سُن ہو رہا تھا۔

"کیوں۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو ؟" چپراسی نے پوچھا۔

نکولس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور چپراسی کے سمجھاتے ہوئے ایک دروازہ کی طرف قدم بڑھایا۔ آگے ایک بہت بڑا کمرہ تھا۔ جہاں بہت سے لوگ اپنی اپنی میزوں پر جھکے ہوئے لکھنے میں مصروف تھے۔ ایک میز سب میزوں سے زیادہ آراستہ نظر آتا تھا اور اس کے سامنے بیٹھا ہوا شخص بھی دوسروں سے زیادہ معزز دکھائی دیتا تھا۔

"کیا آپ ہی اس دفتر کے سیکرٹری ہیں ؟" نکولس نے اس کے قریب جاکر پوچھا۔

"جی ہاں" ۔ اس نے بڑے وقار سے جواب دیا۔ "آئیے تشریف رکھئے آپ مسٹر سٹیفن کے صاحبزادے ہیں نا ؟"

"آج آپ سے مل کر مجھے بہت مسرت ہوئی۔" سیکرٹری کہنے لگا "میرا خیال ہے آپ آج کل اپنے والدین کی تحویل میں ہیں۔ مسٹر سٹیفن میرے بڑے گہرے دوست ہیں۔ کیا آپ ان شرائط پر دستخط کر دینے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے ؟ یہ صرف ضابطہ کی کارروائی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے ایک کاغذ نکولس کے ہاتھ میں دے دیا۔

"تمہیں گاؤں سے باہر جانے کی اجازت نہیں۔"

'کسی کو پڑھانے کی اجازت نہیں ۔'

'ڈراموں میں حصہ لینے کی اجازت نہیں ۔'

اس طرح کئی شرطیں لکھی ہوئی تھیں ۔ جو سب "اجازت نہیں" کے لاحقہ پر ختم ہوتی تھیں ۔

" یہ پابندیاں کاغذ پہ ہی مہتمم بالشان معلوم ہوتی ہیں " ۔ سیکرٹری نے نکولس کی گھبراہٹ دور کرنے کی نیت سے کہا ۔ " یوں تو ہماری زندگی میں اس سے بھی ناگوارتر باتیں واقع ہوتی رہتی ہیں ۔" اس نے ایک قلم نکولس کی طرف بڑھایا ۔

نکولس نے فوراً اپنے دستخط کر دیئے ۔

سیکرٹری نے جاذب سے سیاہی خشک کرتے ہوئے اطمینان کی ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا " بس "۔

نکولس کو اپنے پیچھے کچھ سرگوشیاں سنائی دیں ۔ پیچھے مڑنے پر اس نے دیکھا کہ کمرے کے تقریباً سبھی آدمی اس کی طرف حیرت اور استعجاب کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں ۔

" میرا خیال ہے ہمارے داروغہ صاحب آپ کے منہ بولے باپ ہیں ۔ آپ ان سے مل چکے ہیں ؟" سکرٹری نے پوچھا ۔

" نہیں "۔

"آپ کو داروغہ صاحب سے کہنا چاہیئے کہ وہ پولیس کے آدمیوں کو آپ کے مکان پر جانے سے منع کر دیں۔ میرے خیال میں تو اگر آپ ہفتہ میں ایک بار یہاں آجایا کریں تو بہتر ہوگا۔ ہم لوگ یہاں بیٹھ کر کچھ غپ شپ کر سکیں گے اور ضابطہ بھی پورا ہو جائے گا۔"

نکولس کو وہاں بیٹھے بیٹھے ایسی گھبراہٹ محسوس ہونے لگی جیسے اسکا گلا گھٹ گیا ہو۔ اسے وہ گندا کمرہ بہت بُرا معلوم ہو رہا تھا اور وہ جلد باہر کی تازہ ہوا میں پہنچنا چاہتا تھا۔ لیکن اسی وقت ایک وردی پوش شخص اس کے پاس آیا اور بولا۔

نائب داروغہ صاحب نے حکم فرمایا ہے کہ آپ جانے سے پہلے ان سے مل لیں۔"

حکم کا لفظ سن کر نکولس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" وہ بولا۔

"انہوں نے جو حکم دیا تھا وہ میں نے عرض کر دیا۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ علم نہیں۔"

"بھئی۔ جانا ہی پڑے گا آپ کو"۔ سکرٹری نے نکولس کے کان میں کہا: "قانون کا یہی تقاضا ہے۔"

نکولس نے ایک سگرٹ سلگا لیا اور بے دلی سے قدم رکھتا ہوا اس

آدمی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ ایک برآمدہ میں سے ہو کر نکلے جہاں سے وہی بدبو پھر آنے لگی۔ جو نیچے کے برآمدے میں پھیلی ہوئی تھی۔

"یہاں چوہے بہت ہو گئے ہیں" چپراسی کہنے لگا۔ "پارسال وہ ایک بہت ضروری مسل کھا گئے۔ کاغذ کچھ کچھ چربی جیسی باس دیتے تھے اسلئے چوہوں نے سوائے اوپر کے صفحہ کے کچھ بھی نہ چھوڑا۔"

"تب تو تمہاری مسلیں بڑی لذیذ ہونگی" نکولس نے مزاحاً کہا۔

وہ اب ایک بڑے کمرے میں پہنچ گئے تھے۔ کمرے کے وسط میں ایک لمبی میز پڑی تھی اور اس پر ایک میز پوش بچھا تھا۔ جس پر زری کا کام ہو رہا تھا۔

"اچھا۔ اب آپ اپنا سگرٹ پھینک دیجیئے" چپراسی نے کہا۔

"میں ابھی اسے ختم کیئے دیتا ہوں" نکولس نے زور سے دم کھینچا اور نتھنوں کے راستے دھواں چھوڑ دیا۔

"نہیں۔ نہیں۔ یہ بات ٹھیک نہیں" چپراسی بگڑ کر بولا اور اپنے رومال سے پھیلے ہوئے دھوئیں کو منتشر کرنے لگا۔

اسی اثنا میں نکولس نے سگرٹ کا بچا ہوا ٹکڑا فرش پر پھینک دیا۔ چپراسی نے فوراً لپک کر اسے اٹھالیا۔ لیکن وہ اسے پھینکنے کی کوئی مناسب جگہ نہ پا سکا۔ آخر سمجھا کر اپنے کوٹ کی جیب میں ہی ڈال لیا۔

سامنے ایک دروازہ تھا۔ چپراسی آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا اس کے قریب گیا اور ڈرتے ڈرتے کواڑ کھول کر کہا۔

"حضور! وہ آگئے ہیں۔"

"اچھا۔ انہیں اندر آنے کے لئے کہو۔" ایک درشت آواز سنائی دی۔

"جناب!" نوکر نے نکولس کی طرف مخاطب ہو کر کہا اور دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

نکولس کمرے میں داخل ہوا۔ ایک میز کے سامنے نائب داروغہ بیٹھا ہوا تھا اور کچھ گنگناتا ہوا سامنے پڑے کاغذات الٹ رہا تھا۔ اس نے چپ چاپ نکولس کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر اپنے کاغذات دیکھنے لگا۔

آخر وہ گنگناہٹ بند ہوئی۔ نائب داروغہ نے اپنے ہاتھ کی مسلیں ایک طرف رکھ دیں اور مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا بولا۔

"آپ سٹیفن صاحب کے صاحبزادے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"اوہ۔ آپ کس بیہودہ جھنجھٹ میں پھنس گئے"۔ اس نے کہا اور دروازہ بند کر دیا۔ نکولس خاموش بیٹھا رہا۔

"کیوں بھائی! تم لوگ چاہتے کیا ہو؟" وہ پھر کہنے لگا۔ "کیا مساوات؟
لیکن میرے نوجوان دوست! مساوات کے خواب دیکھنا بے کار ہے
بھی دیکھو تم کیسے دھان پان سے ہو اور میں کیسا جسیم و شحیم ہوں - دنیا
میں ہر شخص کا مذاق اور طبیعت مختلف ہے۔ کوئی تربوز کو پسند کرتا ہے
اور کوئی اسی سے نفرت کرتا ہے۔ پھر مساوات کیسے ممکن ہے؟ اور
پھر خود فطرت بھی مساوات نہیں چاہتی۔ میں تو یہی کہوں گا کہ تم کو ان
لوگوں کی باتوں پر توجہ ہی نہ دینا چاہیئے تھی جو مساوات کا سوال اٹھا
کر بھولے بھالے نوجوانوں کو اشتعال دلاتے ہیں۔
نہیں! ــــــ نہیں!! دنیا میں مساوات کبھی قائم ہوئی ہے
اور نہ مستقبل میں اس کا کوئی امکان ہے۔ میں تمہیں یہ تمام باتیں ایک
پولیس افسر ہونے کی حیثیت میں نہیں سمجھا رہا۔ تمہارا ایک خیر اندیش
ہوتے ہوئے کہتا ہوں۔ مجھے تمہارے والد سے بہت انس ہے۔ کیا
تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے کبھی مساوات کے خواب نہ دیکھے ہونگے ــــــ
نہیں! جوانی کے دنوں میں سب لوگ اس قسم کے خواب دیکھا کرتے
ہیں۔ لیکن ایک وقت آتا ہے جب اپنی حماقت کا علم ہوتا ہے ــــ
خیر ــــــ تم مایوس کیوں ہوتے ہو۔ اب بھی سب کچھ سلجھایا
جاسکتا ہے ــــــــ "

"معاف فرمائیے۔ میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔" نکولس اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ رہا تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے اور آنکھیں اداس اور ویران نظر آ رہی تھیں۔

"سحر ہونے تک"

ابن انشاء

"Sahar hone tak"

Ibne-Insha

۷

باغیچہ بکائن کے گلابی اور شاداب پھولوں سے پٹا پڑا تھا علی الصبح ہی سے طائران خوشنوا کے فردوس گوش چہچہے شروع ہوجاتے تھے۔ پڑوس کے باغیچے میں بلبل نیبو کے پیڑوں پر دادِ نغمہ سرائی دیا کرتے تھے۔ ہریالی اتنی تھی کہ اس جھونپڑے کی چھت پر بھی سبزہ اگا ہوا تھا۔ اب دن کے وقت گرمی زیادہ ہوتی تھی اس لئے پانی کو دیکھ کر تیرنے اور نہانے کی خواہش پیدا ہوا کرتی تھی۔

نکولس اکثر و بیشتر بندوق لئے ندی کے کنارے پر ہی نظر آیا کرتا تھا۔ وہ سٹیفن کے طعنوں سے زچ ہو گیا تھا۔ بوڑھا دن رات پیسے کی تنگی یا نکولس کی بے کاری اور لاپروائی کے متعلق ہی بڑبڑاتا رہتا تھا۔ اس لئے نکولس اب دانستہ اپنے والدین سے دُور دُور رہنے کی کوشش کرنے لگا۔

ندی کے اس پار مرغزاروں میں گھرا ہوا ایک تالاب تھا طرح طرح کی خود رو بیلیں اس کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ فضاؤں میں پرواز کرتے

ہوئے "ریشمین بادل" اس کے آئینہ میں اپنے جمال کا نظارہ کیا کرتے تھے۔ جب نسیم سحر کے جھونکوں سے اس تالاب کا شفاف پانی ہلکورے لینے لگتا تھا تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے فضائے لاجوردی کا حسن اس آئینے میں اپنی نمایش کرنے کے لیے سمٹ آیا ہو۔

صبح کے پرسکون لمحات میں ایسے حسین و جمیل قطعۂ زمین کی آغوش میں لیٹ کر پھولوں کی لوریاں سننے سے زیادہ کونسی چیز نشاط انگیز ہوسکتی ہے۔

نکولس گھنٹوں اس تالاب کے کنارے ہری دوب پر لیٹ رہا کرتا تھا۔ اس وقت اس کو ایک بے پایاں سرور محسوس ہونے لگتا تھا۔ دل کی ساری آشفتگی دور ہوجاتی اور اس کے دل میں شباب کا جوہر اس طرح چھلکنے لگتا تھا۔ جیسے اس تالاب میں آسمان کا عکس جمیل۔ اس کے تمام اندیشے اور تفکرات کچھ دیر کے لئے غائب ہوجاتے اور دل میں زندگی کی سچی مسرت موجزن ہونے لگتی تھی۔

کبھی کبھی کوئی آبی پرندہ تیرتا ہوا ساحل پر آجاتا اور کنارے پر جھکی ہوئی بیلوں سے الجھتا ہوا اپنے ساتھیوں کو پکارنے لگتا تھا۔ اس وقت نکولس چاہتا تو بڑی آسانی سے اس کا شکار کرسکتا تھا۔ لیکن وہ ایسے موقع پر اپنی بندوق کو ہاتھ تک نہ لگاتا تھا۔ وہ کمال یکسوئی سے اس جنت نگاہ

کے نظارہ میں مگن رہتا۔ اس وقت اسے یوں محسوس ہونے لگتا تھا کہ وہ فطرت کے رفیع و دقیق اسرار تک رسائی پا سکتا ہے۔ تب اسے نہ اپنے گھر کا خیال رہتا اور نہ لوگوں کی چہ میگوئیوں کا۔ وہ اپنے تصورات کی حسین فضاؤں میں پرواز رہتا اور عیش دوام کے سنہرے خواب دیکھا کرتا تھا۔

کچھ دنوں سے نکولس پر انگشت نمائیوں اور خوردہ گیریوں کی یورش زیادہ شدت اختیار کر گئی تھی۔ لوگ اسے راستہ چلتے چلتے ٹوکنے لگے تھے گھر پر بھی اسے چین میسر نہ تھا۔ اس کی ماں تو صرف ایک آدھ مرتبہ کہہ کر ہی رہ جاتی تھی۔ لیکن سٹیفن جب بھی اسے دیکھتا تھا جلی کٹی سنائے بغیر نہ چھوڑتا تھا۔ اگر نکولس کبھی باغیچہ میں بیٹھ کر کسی کتاب کا مطالعہ کرنے لگتا تو سٹیفن کہتا۔

"واہ! اس سے زیادہ لطف کی زندگی اور کونسی ہو سکتی ہے۔ کھانے پینے کو سب کچھ مہیا ہو اور کام کے نام سے ایک تنکا نہ دوہرا کرنا پڑے۔"

اگر نکولس کہیں باہر چلا جاتا تو بوڑھا اس کے جوتے کی شومیٔ قسمت کی تصویر کھینچنے لگتا تھا۔ لیکن سٹیفن یہ سب کچھ صرف اپنے بیٹے کو چڑانے یا اسے ٹھیس پہنچانے کی نیت سے نہ کرتا تھا۔ اس کا مقصد فقط یہ تھا کہ نکولس سیدھے راستے پر آجائے۔

جب اسے نائب داروغہ نے بوڑھے سے اس کے بیٹے سے ملاقات کا

تذکرہ کیا تھا۔ سٹیفن کے دل میں روز بروز یہی آرزو پرورش پانے لگی کہ نکولس کے خیالات میں کچھ اصلاح ہو جائے۔ یہی وجہ تھی کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی وہ اپنے لڑکے کو کوسنے دینے لگتا تھا۔

ایک دن سٹیفن کی سرِ راہے داروغہ سے ملاقات ہو گئی۔ بوڑھا اسے دیکھ کر بہت گھبرایا۔ وہ اب گاؤں کے کسی شناسا آدمی سے ملتے ہوئے جھجکتا تھا۔ اسے ان لوگوں کو منہ دکھاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس سے کوئی ناشائستہ فعل سرزد ہو چکا ہے جو اس ایسے خاندانی اور معزز شخص کے شایانِ شان نہ تھا۔

"آپ تو کبھی آتے ہی نہیں۔" داروغہ نے پوچھا۔

"ارادہ تو بہت دن سے تھا لیکن موقع ہی نہ مل سکا۔" سٹیفن نے آنکھیں نیچی کر کے کہا اور میریا کی طبیعت ناساز ہونے کا عذر پیش کر دیا۔

"اور نکولس تو ایک ہی حضرت نکلا۔ اس نے ابھی تک اپنی شکل ہی نہیں دکھائی۔" داروغہ بولا۔

سٹیفن کچھ شرمندہ ہو کر دل ہی دل میں بیٹے کو اس کی لاپرائی کیلئے کوسنے لگا۔ پھر ایک لمبی آہ کھینچتے ہوئے بولا۔" وہ آتے ہوئے جھجکتا ہے وہ اپنے چند عاقبت نااندیشانہ افعال کی وجہ سے منہ چھپائے ہے۔ اب

اسے اپنی شکل لوگوں کو دکھاتے ہوئے شرم آتی ہے"۔

"اونہہ! اس میں شرمانے کی کیا بات ہے۔ گذشت آنچہ گذشت۔ گئی گذری باتوں کے لیئے اسے کوئی مطعون نہیں کرے گا"۔

"تاہم وہ جھجکتا ہے"۔ شبیفن کہنے لگا۔" اسے خیال ہے کہ آپ اس سے خفا ہیں۔ کیونکہ اگرچہ آپ اسے اپنا بیٹا سمجھتے ہیں لیکن ہیں تو پولیس کے داروغہ ہی آخر"۔

داروغہ کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

"اجی نہیں"۔ وہ کہنے لگا۔" یوں تو دنیا میں کوئی بھی کوتاہیوں سے بری نہیں۔ اسے آپ ضرور میرے پاس بھیجیں۔ اگر میں اسے کچھ سخت سست کہوں گا بھی تو اس کے ایک بزرگ کی حیثیت سے کہوں گا۔ داروغہ کی حیثیت سے نہیں۔ خود ہی سوچو یہ لوگ کتنے غلط اندیش ہیں۔ ابھی ان کی مسیں بھیگنے نہیں پاتیں کہ آزادی کا مطالبہ شروع کر دیتے ہیں"۔

داروغہ پھر ہنس دیا۔ ہنستے وقت اس کا تمام جسم ہلنے لگتا تھا۔ شبیفن اس کی رواداری اور "گرم گستری" کی وجہ سے دبا جا رہا تھا۔ بوڑھے کی آنکھوں میں مسرت چھلکنے لگی۔ اور اس کا ہاتھ فرطِ مسرت سے تھرتھرانے لگا۔

" ہم دقیانوسی بوڑھے بھی تو ایک دن ان کی طرح جوان تھے"۔

سٹیفن بولا۔ "سچ پوچھیے تو نکولس بہت مؤدب اور بھلا لڑکا ہے۔ لیکن اس کی معقولیت نہ جانے یکایک کیسے غائب ہو گئی ہے۔"

داروغہ کو اخلاقاً سر ہلاتے دیکھ کر سٹیفن کا حوصلہ اور بھی بڑھ گیا اور اس نے پوچھا۔ "لیکن کیا اب غلطی کی تلافی کا کوئی امکان نہیں ہے؟ کاش وہ اپنے سکول واپس جا سکتا اور ــــــــ"

"کچھ دن ٹھہریئے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" داروغہ نے یقین دلایا اور بوڑھے سے مصافحہ کر کے اپنے راستے پر ہو لیا۔ سٹیفن نے جاتے ہوئے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور کہا۔ "غضب کا آدمی ہے یہ بھی۔"

اس دن سٹیفن گھر لوٹا تو اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ راستے میں بھی وہ چھاتا گھماتا ہوا کسی پرانے گربت کے بند گنگناتا رہا۔

اس دن کھانے کے وقت سٹیفن بہت خوش تھا۔ نکولس کی طرف محبت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولا "آیئے اشتراکی جی مہاراج"۔ میریا سے بھی اس نے کچھ مذاق کیا۔ کھانے کے بعد وہ کمرے میں ٹہلنے اور پھر کوئی گیت گنگنانے لگا۔

"آج ایسی کیا خوشی کی بات ہوئی ہے کہ ایک دم گانا بھی شروع کر دیا؟" میریا نے قدرے متعجب ہو کر پوچھا۔ لیکن سٹیفن نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ ایک عجیب انداز سے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ گھما گھما کر اور بھی

مست ہو کر گانے لگا۔

میریا بھی اپنے شوہر کو خوش دیکھ کر چہک اٹھی۔ اس نے چائے کی میز کے لئے ایک نیا رومال نکالا اور ناشتہ تیار کرنے میں بھی بڑی مستعدی ظاہر کی۔

چائے پیتے وقت سٹیفن نے اپنے بیٹے کو مذاق کے لہجے میں خطاب کرتے ہوئے کہا "آئیے حضرت اشتراکی صاحب۔ آپ کو ایک خوشخبری سنانا ہے۔ آیئے تشریف رکھئے۔"

نکولس اس آواز کو سن کر کانپ اٹھا اور اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ آج اپنے باپ کو اچانک مسرور دیکھ کر وہ سراسیمہ سا ہو گیا۔ جب وہ سٹیفن کے قریب آکر کرسی پر بیٹھا اس کا دل کسی نادیدہ مصیبت کے تصور سے بیٹھا جا رہا تھا۔

"میں نے تمہیں ہزار مرتبہ اپنے منہ بولے باپ کے پاس جانے کو کہا۔ لیکن تم تو کان ہی نہیں دھرتے۔"

"یا اللہ۔ پھر وہی ذکر" نکولس دل ہی دل میں کسمسایا۔

تب سٹیفن نے داروغہ سے اپنی ملاقات اور گفتگو کا حال مزے لے لے کر بیان کرنا شروع کیا۔ کہیں کہیں اپنی طرف سے بھی کچھ بڑھا گھٹا دیا تاکہ نکولس کو مصمم یقین ہو جائے کہ داروغہ نے واضح الفاظ میں

نکولس کو دوبارہ کالج میں داخل کرا دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ نکولس اپنے دماغ سے اشتراکی خیالات کی غلاظت نکال پھینکے اور پھر اپنی راہ پر آ جائے۔"

"یعنی۔ دارو غہ غضب کا آدمی ہے۔" سٹیفن نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا اور پھر اپنے بیٹے کو ہدایت کرنے لگا۔" میں کہتا ہوں تم اگلے اتوار کر جا کے سیدھے دارو غہ کے ہاں جاؤ۔ ہم لوگوں کی بات مانو اور ذرا عقل سے کام لو۔ اس وقت جو فعل مناسب اور سود مند نظر آئے وہی کرو۔ اور بس، پھر سب معاملہ سلجھ جائے گا۔"

نکولس چپ چاپ میز پوش کے پھولوں پر نظر جمائے بیٹھا رہا۔ ادھر سٹیفن کہہ رہا تھا۔" اب ان احمقوں کو چھوڑ دو۔ فطرت خود تمہارے معتقدات کی مؤید نہیں ہے۔ وہ مساوات کے ادعا کو بار آور نہ ہونے دیگی۔"

"میرا خیال ہے تم اس موقع پر اپنا سر جھکا لوگے تو وہ ٹوٹ نہ پڑے گا" بوڑھے نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن وہ بھی کبھی ٹوٹ کر گر پڑتا ہے۔" نکولس نے دبی آواز سے کہا۔

سٹیفن کا چہرہ غصہ کے مارے تمتما اٹھا۔ اس نے ایک چمچہ زور سے میز پر پٹختے ہوئے چلا کر کہا۔" تب تم سے بڑھ کر۔ بے وقوف دنیا بھر میں کوئی

نہ ہوگا ——— سمجھے ؟"

"جی ہاں ——— سمجھ گیا۔"

"میں کہتا ہوں کہ تمہیں جانا ہوگا۔ میں ان سے وعدہ کر چکا ہوں۔"

"نہیں۔ میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔" نکولس دھیمی آواز میں بولا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا ؟" سٹیفن آگ بھبوکا ہو کر چلّا اٹھا۔

بیچاری بیبر یا کو کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا کہ اس بھیانک تماشے کو روکنے کے لئے اسے کیا کرنا چاہیئے۔ وہ سٹیفن کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی اور اس کا بازو پکڑ کر کہہ رہی تھی۔ "خدا کے لئے ایسا نہ کرو۔"

نکولس نے ٹوپی سر پر رکھ لی اور پھاٹک کی طرف بڑھا۔ بوڑھے والدین دیکھتے ہی رہ گئے اور وہ باغیچے سے باہر نکل بھی گیا۔ جلد جلد قدم اٹھاتا ہُوا وہ ندی کے قریب جا پہنچا۔ اس کے ہونٹ پھڑک رہے تھے اور وہ آبدیدہ ہو رہا تھا۔

وہ ندی کے کنارے پر ایک اونچی سی جگہ دیکھ کر بیٹھ گیا اور متجسّس نگاہوں سے سامنے پھیلے ہوئے مرغزار کی طرف دیکھنے لگا۔

سورج آہستہ آہستہ دھندلکوں میں روپوش ہو رہا تھا اور غروب ہوتے ہوئے فطرت کی حسین بہاروں کو اداس اداس نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

افق پر سیاہی بتدریج گہری ہوتی جارہی تھی جیسے کوئی محبوبہ بصد ناز اپنا سیاہ آنچل پھیلا رہی ہو۔ دیکھتے دیکھتے اس تابناک شام کے منظر کا خاتمہ ہوگیا۔ ندی کے نیلے اور گہرے پانی میں درختوں کے سائے لحظہ بہ لحظہ تاریک تر نظر آنے لگے۔ آسمان گھنی سیاہیوں کے دامن میں چھپ گیا اور بادل مہیب دیووں کی طرح نظر آنے لگے۔

نکولس ندی کے کنارے درختوں کے نیچے بیٹھا تھا۔ اردگرد بوسیدہ گھاس اور گیلی مٹی کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ درختوں کے پتے ہوا کے جھونکوں سے کھڑکھڑا رہے تھے اور پانی کے بہاؤ کی سریلی ترل رل کے ساتھ سُر ملا کر گانے ——— یا رونے کی کوشش کر رہے تھے۔ فطرت اپنے ہی خیالات میں محو معلوم ہوتی تھی۔ صرف کسی مرغابی کی چیخ یا کسی چونکی ہوئی بطخ کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ ماحول کے بے پایاں سکون میں کبھی کبھی مخل ہو جاتی تھی۔

نکولس بہت دیر تک اس منظر کو دیکھتا رہا۔ جب تاریکی اچھی طرح پھیل گئی اس کے خیالات لب جُو کے نظاروں کی وسعتوں سے پرے پرواز کرنے لگے۔ اس نے دیکھا۔ جیسے ان چراگاہوں سے دُور ——— بہت دُور ندی کے کنارے ایک پُرسکون جھونپڑا ہے جو ہر طرف سے چمن اور خودرَو پودوں کی باڑوں سے گھرا ہُوا ہے اور اس حسین محل سے ایک

دوشیزہ کی شیریں آواز آرہی ہے۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ تاریک اور پُرسکون کنج کسی کے جمال کی ایک جھلک سے منور ہوگیا ہے۔

نکوس گھنٹوں گولیا کے تصوّرات میں محو وہیں بیٹھا رہا۔ وہاں اس کے خیالات کو برہم کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ہر طرف سکون اور خاموشیوں کا تسلّط تھا۔ صرف خواب آلودہ لہروں کی سُریلی ترل رل کی آواز کان میں آرہی تھی۔ لیکن وہ بھی گویا اپنی الفاظ سے مستغنی آواز میں افق کے دھندلے پردوں میں چھپی ہوئی اسی پُرسکون دنیا کی دلفریب کہانی کہہ رہی تھی۔ جس دنیا میں گولیا رہتی تھی۔

نکوس اس خیالی دنیا کے تصوّر میں محو ایک پُرانا گیت گانے لگا۔

ات ات بھٹکت دن بیتت ہے
تارے گن گن رات

. . . .

اس کی لَے کتنی سوزناک تھی۔ رات کی ان خاموش گھڑیوں میں اس کا گانا ندی کے نواح میں گونجتا ہوا کسی ان جانی۔ ان بوجھی دنیا کی طرف رواں تھا۔ شاید گولیا بھی اسی طرح اپنے محبوب کا تصوّر کئے نیپر کے کنارے کہیں بیٹھی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہوا اس کا پیامِ محبت پہنچانے کے لئے سن سن کرتی ہوئی اسی دنیا کی طرف بڑھ رہی ہو

جہاں حسین گو لیا بیٹھی ہو گی۔

اس اثنا میں چاند کافی بلندی پر جا پہنچا تھا۔ چاندنی میں ندی کی دھیمی لہریں جھلمل جھلمل کر رہی تھیں۔ کھیتوں میں کہیں کہیں کسی کسان کی جلائی ہوئی الاؤ نظر آجاتی تھی۔ یکایک نکولس کو کسی کی آواز سنائی دی۔

" اوہو۔ ان تنہائیوں میں آپ ہی گا رہے تھے ؟"

نکولس چونک پڑا اور مڑ کر دیکھنے لگا۔ وہ اس طرح گھبرا گیا جیسے کسی نے اسے کسی ناشائستہ فعل کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھ پایا ہو۔ کچھ لمحوں کے بعد درختوں کی اوٹ سے ایک شخص نکل کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا اور بولا " کیا آپ نے مجھے نہیں پہچانا ؟ میں آپ کے والد کا دوست محرّر ہوں "

" اوہو۔ آپ ہیں ؟ "

" واقعی آج کی رات بڑی دلکش ہے " محرّر کہنے لگا " ہاں ہاں گائیے۔ میں بھی گانے کا بڑا شوقین ہوں۔ پہلے میں ہی گرجا کی حمد گانے والی پارٹی کا سردار تھا "

محرّر کھانستا ہوا نکولس کے پاس بیٹھ گیا۔

" کہیئے۔ داروغہ صاحب سے تو آپ مل آئے نا ؟ "

نکولس نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ اچھل کھڑا ہوا اور بغیر کچھ کہے سنے ایک طرف کو چل دیا۔ "شیطان یہاں بھی دامنگیر رہا۔" اس نے دل میں کہا اور بہت جلد جھاڑیوں میں اوجھل ہو گیا۔

مُحترز بھونچکا سا رہ گیا۔ وہ بہت دیر تک ان جھاڑیوں کی طرف کھڑا دیکھتا رہا۔ جن کی اوٹ میں نکولس غائب ہو گیا تھا۔

۸

نکولس بڑی دیر تک ندی کے کنارے گھومتا رہا اور جب اندھیرا گہرا ہو گیا وہ گاؤں کے نواحی میدان میں آکر ٹہلنے لگا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ چاروں طرف خاموشی اور سکون کا راج تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے چاند بھی اس آفاقی سکون کو دیکھ کر متحیّر رہ گیا ہو۔ صرف سڑک کے قریب ایک دلدل میں مینڈک ٹرا رہے تھے اور پاس ہی کوئی آدمی دردناک آواز میں ایک اداس گیت گا رہا تھا۔ لیکن وہ ماحول کے سکون میں خلل کا موجب نہ ہو رہا تھا۔

رات کافی گزر گئی تھی۔ نکولس وہیں ٹہلتا رہا۔ بستی میں کہیں کہیں کوئی چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ کبھی کبھی کسی دُور افتادہ محلے سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی یا گھنٹہ گھر کی گھڑی کی ٹن ٹن کی سُریلی آواز فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتی تھی اور یوں معلوم ہونے لگتا تھا جیسے آسمان میں منتشر سیمیں کرنوں کے تار ایک ساتھ جھنجھنا اُٹھے ہوں۔

چاندنی لحظہ بہ لحظہ زیادہ صاف ہوتی جارہی تھی۔ چاند بہت اونچا پہنچ گیا تھا۔ نکولس اب بھی وہاں سے نہ ہٹا ــــ وہ کھیتوں اور جھاڑیوں کے آس پاس گھومتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے سڑک پر جھکی ہوئی درختوں کی ڈالیاں بھی بہزار کاہش یہ جاننے کے لئے مضطرب ہوں کہ نیم شب کی اس سنسان ساعت میں وہ شخص اکیلا کیوں بھٹک رہا ہے۔

یکایک اس نے سیٹی کی تیز آواز سنی اور کسی نے کرخت آواز میں پوچھا "کون؟"

نکولس پہچان گیا۔ وہ گاؤں کا چوکیدار تھا۔ قریب آنے پر بوڑھا چوکیدار بھی نکولس کو پہچان گیا اور مسکراتا ہوا بولا "اوہ۔ آپ ہیں، لیکن اس وقت آپ یہاں کہاں۔ کیا نیند نہیں آتی؟"

"ہاں" نکولس نے جواب دیا۔

"واقعی آج کی رات بڑی سرور انگیز ہے اور آپ ایسے نوجوانوں کو ایسی حسین رات میں نیند نہ آئے تو حیرت کی کوئی بات نہیں" بوڑھا کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اور لنگڑاتا ہوا چل دیا۔

میدان چاندنی کی کرنوں سے اسی طرح روشن تھا۔ اسی طرح مینڈکوں کی ٹرٹر اور اس البیلے جوان کا گیت سنائی دے رہا تھا۔ اسی وقت گھنٹہ گھر میں ٹن ٹن کی آواز گونج اٹھی۔ نکولس اٹھ کھڑا ہوا اور گھر کی جانب چل دیا۔

راستے میں وہ یکایک ایک مکان کے سامنے رُک گیا۔ مکان کے
ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ ایک شخص میز کے سامنے بیٹھا کھانا
کھا رہا تھا اور سامنے ایک نوجوان عورت کھڑی تھی۔ وہ شاید اس شخص
کی بیوی ہو گی۔ اس کا خاوند بڑے مزے سے کھانا کھاتا جاتا تھا اور
اس سے مذاق کرتا ہوا شور مچا رہا تھا۔

نکولس اس منظر کو دیکھ کر بے ساختہ مسکرا دیا۔ "یہ جوڑا کتنا مطمئن
معلوم ہوتا ہے"۔ وہ چلتے چلتے سوچنے لگا۔ "معلوم ہوتا ہے ان لوگوں
کو کسی امر کا فکر ہے اور نہ کسی قسم کا اضطراب۔"

گھر قریب آ گیا تھا۔ نکولس جوں جوں اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگا
اس کے پاؤں نہ جانے کیوں رُکنے لگے۔ آج ہری ہری بیلوں سے
[illegible] آراستہ مکان اسے سنسان اور وحشت ناک نظر آ رہا تھا۔ اس کا دل آگے
[illegible] بڑھنے سے ہچکچا رہا تھا۔ وہ گھر جہاں نکولس نے بڑے چاؤ چونچلوں میں
[illegible] اپنا بچپن گزارا تھا آج اسے اتنا خوفناک معلوم ہوا جیسے کوئی راکشس
[illegible] منہ کھولے کھڑا ہو۔

ڈرتے ڈرتے نکولس نے پھاٹک کی چٹخنی پہ ہاتھ رکھا لیکن جونہی
اس نے دروازہ کھولا۔ اسے قریب ہی سے اپنے والد کے کھانسنے کی
آواز آئی۔ واقعہ میں سٹیفن پھاٹک کے قریب نیچے ہوئے ایک بنچ پہ بیٹھا تھا

لیکن نکولس اسے دیکھ نہ پایا تھا کیونکہ بیچ پر کسی جھاڑی کا سایہ پڑ رہا تھا۔

"کون ؟ نکولس !" بوڑھے نے بھرّائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

نکولس ہکا بکا سارہ گیا۔ اسے اپنے والد کی موجودگی کا گمان تک نہ تھا۔ گھبرا کر بول اٹھا" اچھا۔ آپ ابھی باہر ہی بیٹھے ہیں" —— فرمائیے!"

"صرف فرمائیے۔ کہہ دینے سے کام نہیں چلے گا۔" بوڑھا بولا "سنو! آج میں داروغہ کے ہاں گیا تھا۔ واقعی وہ کوئی معمولی آدمی نہیں۔ گو تم اس کی طرف سے لاپروائی برتتے ہو۔ تاہم وہ تمہیں اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتا ہے۔ آج اس نے کہا ہے کہ اگر تم ایک درخواست لکھ کر التجا کرو کہ جو کچھ تم سے سرزد ہوا ہے وہ دوسروں کے بہکانے سے ہوا ہے اور آئندہ ایسی تحریکات سے محترز رہنے کا وعدہ کرو تو سب معاملہ سلجھ جائے گا۔"

نکولس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چپ چاپ سنتا رہا۔

"اور میں بھی اپنی طرف سے ایک درخواست لکھوں گا۔" بوڑھے نے اپنی تقریر جاری رکھی۔" میں عرض کروں گا کہ مجھے وفاداری سے سرکارِ عالیہ کی ملازمت کرتے ہوئے آج پینتیس سال ہو گئے ہیں۔ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میرے ہاتھ تھرتھراتے ہیں۔ اب مجھے سبکدوش کر دیا جائے"۔

نکولس کا گلا گھُٹ رہا تھا۔ اپنے والد کی باتیں سن کر اس کا دل

رقت سے بھر آیا۔ لیکن سٹیفن نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھا۔

" اور تب داروغہ بھی اپنی طرف سے سفارش کر دے گا۔ سب باتیں ٹھیک ہو جائیں گی اور تم پھر اپنی تعلیم کا سلسلہ شروع کر سکو گے "۔

نکولس پھاٹک کے قریب اس طرح کھڑا تھا جیسے کسی سنگین سزا کا حکم سن رہا ہو۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ ہاتھ لٹک رہے تھے اور زبان سے کوئی لفظ نہ نکل رہا تھا۔ چاروں طرف سناٹا چھا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے رات سانس روک کر نکولس کے دل کے اتار چڑھاؤ کا اندازہ کر رہی ہو۔ آسمان پر ان گنت تارے ٹمٹما رہے تھے۔

اسی وقت ایک مچھر اس کے کان کے قریب آکر بھنبھنانے لگا اسکی بھن بھن نکولس کے دماغ میں گونج اٹھی۔ پاس ہی ایک کتا زور زور سے بھونکنے لگا۔ نکولس کے دل میں ایک خوفناک طوفان بپا تھا۔ اسے مچھر کی وہ بھنبھناہٹ کسی کا درد بھرا نالہ بن کر سنائی دے رہی تھی۔

" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس لئے کل تمہیں داروغہ صاحب کے پاس جا کر ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے "۔ بوڑھا پھر کہنے لگا۔

" نہیں ــــــ میں نہ کہیں جانے کے لئے تیار ہوں اور نہ کوئی تحریر لکھ کر دینے کے لئے "۔ نکولس نے دھیمی آواز میں جواب دیا اور اپنے کمرے کی جانب قدم بڑھایا۔

"کیوں ؟" سٹیفن نے چلاکر پوچھا۔
" نہیں۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔"
" لیکن پیٹ میں کھانا تو بڑی آسانی سے ٹھونسا جا سکتا ہے نا ۔۔ ؟
اس میں تو تمہیں کوئی مشکل پیش نہیں آتی ہو گی۔" بوڑھے نے تلخ ہو کر کہا
" میں کہتا ہوں۔ خدا کے لئے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ مجھے مت ستاؤ۔"
نکولس پاگلوں کی طرح چلا اٹھا اور دوڑ کر اس کوٹھڑی میں گھس گیا جو باغیچے کے عقبی حصے میں بنی ہوئی تھی اور جسے وہ لوگ کبھی غسل خانہ کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔ کچھ دنوں سے نکولس نے اسی کوٹھڑی میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔
سٹیفن آگ بگولا ہو کر چلا اٹھا "بدمعاش"! سارا ماحول گونج اٹھا اور چاروں طرف سے اس کی بازگشت کی آواز سنائی دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سنسان اور پرسکون رات ہی اپنی پوری قوت سے چلا اٹھی ہو ——— "بدمعاش !"
کوٹھڑی میں گھس کر نکولس نے ایک موم بتی جلائی۔ کمرے کا فرش سیلا تھا اور چھت سیاہ۔ ایک کونے میں نہانے کا ٹب الٹا پڑا تھا۔ اس پر کچھ کتابیں پڑی تھیں۔ دوسری طرف ایک چوڑی بنچ بچھی تھی

جس کے قریب ایک کرسی تھی۔ دیوار پر بے شمار سائے ناچ رہے تھے بتی کی لو ہوا کے جھونکوں سے کانپ رہی تھی۔ نکولس نے چھوٹی سی کھڑکی کھول دی اور کمرے میں اس طرح ٹہلنے لگا جیسے پنجروں میں بند جانور ٹہلا کرتے ہیں۔ لیکن اسے چین نہ آتا۔ اچانک اسے اپنے اعضا میں ایک خوفناک خستگی اور تھکن سرایت کرتی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ بتی بجھا کر بنچ پر دراز ہو گیا۔

کھڑکی میں سے چاندنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ دیوار کے پاس کی جھاڑی کے پتے کبھی کبھی کھڑکھڑا اٹھتے تھے۔ قریب ہی ایک جھینگر جھنکار رہا تھا۔ نکولس بہت دیر تک پیشانی پر ہاتھ رکھے لیٹا رہا۔ اس کے دماغ میں بے شمار بے ربط باغیانہ خیالات امڈ آئے تھے۔ اچانک اسے سڑک پر جاتی ہوئی کسی گاڑی کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دی۔ آہستہ آہستہ وہ آواز ماند پڑ گئی۔ اور دور جا کر رات کی بے پناہ خاموشیوں میں تحلیل ہو گئی۔ کوئی قسمت کا مارا کہیں چلا جا رہا تھا۔ نکولس اس کی آواز سن کر سوچنے لگا " اب میں بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے بھی کوچ کر دینا چاہیئے۔ جلد ہی۔ بہت جلد۔ آہ! یہ درد ناقابل برداشت ہے اور یہ تھکن کتنی بھیانک ہے! کتنی بوجھل ہے . . . . "

یکایک باغیچے میں ایک مرغی چلا اٹھی اور زور سے پر پھڑپھڑانے لگی۔

قریب ہی کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کھڑکی کے پاس کوئی دبے پاؤں چل رہا ہو۔ نکولس چونک پڑا اور اچک کر اپنی بندوق سنبھال لی۔

"کون ہے؟" اس نے خوف زدہ سا ہو کر پوچھا۔

"میں ہوں بیٹا" کسی عورت کی روندھی ہوئی آواز سنائی دی اور چاندنی کی دھندلی روشنی میں نکولس کو کھڑکی کے باہر اپنی والدہ کا چہرہ دکھائی دیا۔

"ارے تم ہو امی!" لڑکے نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"بیٹا! آج تم سوئے کیوں نہیں" بڑھیا نے دردناک آواز میں پوچھا "تم اداس کیوں ہو!"

وہ آگے نہ بول سکی اور کھڑکی میں جھک کر سسکیاں لینے لگی۔ نکولس اس کے قریب گیا اور کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن اچانک اس کا گلا بھر آیا۔ آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور وہ بڑی مشکل سے صرف اتنا کہہ سکا ——— "امی۔ خدا کے لئے اپنی جان کو دکھ نہ دو۔"

"کولیا! میرا دل تمہیں دیکھ کر ایسا بھر آیا ہے کہ میں کسی طرح اپنے آنسو نہیں روک سکتی۔"

نکولس وہاں کھڑا نہ رہ سکا۔ وہ لپک کر کوٹھڑی کے ایک تاریک

کونے میں جا چھپا اور ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسک سسک کر رونے لگا۔ اس کے گالوں پر گرم گرم آنسوؤں کی ندی بہ رہی تھی اور دل اندر ہی اندر کسی ناقابلِ برداشت درد سے کٹا جا رہا تھا۔

میریا اندھیرے میں راستہ ٹٹولتی ہوئی آئی۔ اس نے اپنے بیٹے کے کندھے پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ گھنٹوں تک دونو ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے اس اندھیرے کونے میں چپ چاپ آنسو بہاتے رہے۔ تب وہاں سے اٹھے اور بنچ پر بیٹھ گئے۔ ماں نے اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی سوکھی انگلیاں اپنی ساری قوت سے نکولس کا ہاتھ دبانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"نہیں! نہیں!! میں اب یہاں نہیں ٹھیر سکتا۔ مجھے اب کہیں چلے ہی جانا چاہیئے۔" نکولس سسکیاں بھرتا ہوا بولا۔

"کیوں۔ کیوں؟؟ کہیں تمہارے بابا نے برا بھلا کہہ کر تمہارا دل تو نہیں دکھایا؟" بڑھیا اپنے بیٹے پر جھک کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

نکولس اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ اس وقت اُسے ایسا محسوس ہُوا جیسے وہ پھر ایک ننھا بچہ بن گیا ہو۔ اس کے دل میں اپنی والدہ کے لئے اتنی ہی محبت اُمڈ آئی جتنی کبھی بچپن میں رہی ہوگی۔ نکولس کو

اس وقت اپنی والدہ اتنی عزیز معلوم ہوئی کہ وہ اس کے لئے اپنی زندگی نثار کرسکتا تھا۔ اس نے اپنے سوکھے ہونٹ اٹھاکر بڑھیا کے استخوانی ہاتھ پر رکھ دئے۔ میریا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ رہی تھی۔

"میں کیا کروں؟" وہ دھیمے لہجہ میں بڑبڑا رہا تھا "مجھے کوئی راستہ نہیں سوجھتا۔ یہ زندگی اب میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ مجھے بہت جلد یہاں سے بھاگ جانا چاہیئے۔ کہیں دور بھاگ جانا چاہیئے۔"

"ایسی رنج دہ باتیں کیوں کر رہے ہو بیٹا ذرا اپنے بوڑھے باپ کا بھی خیال کرو۔ کیا تمہیں ان پر ذرا رحم نہیں آتا۔ دیکھو وہ ابھی تک رو رہے ہیں۔ نکولس! کم ازکم ان کی ضعیفی کے خیال ہی سے ان کی بات مان لو چھوڑو ضد کو ــــــ آہ ــــــ تم . . . ؟

تب بڑھیا نہایت دردناک لہجہ میں موت اور زیست کے معانی سمجھانے لگی۔ اس نے اسے بتایا ماں باپ کا دل کیا چیز ہوتا ہے۔ بڑھاپا کس خوفناک شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ زندگی کی بھول بھلیاں کتنی پُرپیچ ــــــ بلکہ لاینحل ہوتی ہیں۔"

نکولس چپ چاپ اس کی عجیب وغریب باتیں سنتا رہا۔ وہ بڑھیا کے الفاظ کا اصل مطلب تو نہ سمجھ سکا ہاں وہ محبت بھرے الفاظ اس کے دل کو

ایک تسکین ضرور بخش رہے تھے۔

"۔ ۔ ۔ اسلئے میری التجا مان کر جو کچھ وہ کہیں تم لکھ دو۔" بڑھیا نے کہا۔

نکوس کو رات کی بات یاد آگئی۔ اس نے سر ہلا کر کہا۔

"نہیں۔ میں ہرگز نہیں لکھوں گا۔ اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو مجھ سے اس بات کا مطالبہ نہ کرو۔"

پھر ایک سرد آہ بھر کر وہ بڑبڑایا۔" مجھے اب ضرور رخصت ہو جانا چاہیئے ——"

"کیوں بار بار چلے جانے کا ذکر کر رہے ہو بیٹا! تم کہاں جا سکتے ہو تم کہیں نہیں جا سکتے!! تم جانتے نہیں۔ تمہارے والد پر کتنی بڑی ذمہ داری عائد ہے؟"

نکوس کچھ نہ بولا۔ دونو بڑی دیر تک چپ سادھے بیٹھے رہے۔ دونو کے دل میں طرح طرح کے خیالات سر اٹھا رہے تھے۔ کائنات خاموش تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تاریکی میں بیٹھے ہوئے ان لوگوں کے دل کا حال جاننے کے لئے رات بھی چپکے چپکے کھڑکی میں سے جھانک رہی ہو۔

. . . .

قریب ہی ایک مکان کے چھوٹے سے کمرے میں دیا جل رہا تھا کمرے کی

دیوار پر خدا کے برگزیدہ بیٹے حضرت عیسیٰؑ کی مقدس تصویر آویزاں تھی"
جس کے سامنے سٹیفن گھٹنوں کے بل جھکا ہوا نہایت درد بھرے لہجہ
میں دعا کر رہا تھا۔

"مقدس باپ! خداوند!! اس گمراہ بچے کو راہ دکھا۔ اس
کی رہنمائی کر!!"

۹

گرمی کے دن تھے اور دوپہر کا وقت۔ آسمان پر ابر کا نشان تک نہ تھا۔ سورج کی تپش اور تمازت آنکھیں اوپر اٹھانے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ ابابیلیں سڑک کی دھول میں نہا رہی تھیں اور کوّے پنکھے پھیلائے آرام کر رہے تھے۔ گاؤں بھر گرمی کی وجہ سے پریشان تھا۔ سب لوگ اپنے گھروں میں گھسے اونگھ رہے تھے۔ اس وقت کسی کے دل میں یہ خواہش ہی نہ پیدا ہوتی تھی کہ ہمسائے کی خبر لے۔ اسلئے پڑوس میں اس باغیچہ والے مکان میں کیا گزر رہی ہے۔ یہ جاننے کی کسی کو تشویش تھی اور نہ مہلت۔

مذکورہ مکان کے سامنے اس وقت ایک چھوٹی سی گاڑی کھڑی تھی۔ گھوڑا دم سے مکھیاں اڑاتا ہوا اونگھ رہا تھا اور کوچبان چار دیواری پر بیٹھا جوتے کی مٹی جھاڑ رہا تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ صرف مکان کی کھلی کھڑکی سے نہ جانے کس کی درد بھری چیخیں بار بار سنائی پڑتی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی شخص زبردست درد میں مبتلا ہو جس کی

ناقابلِ برداشت تکلیف سے بے چین ہو کر رہ رہ کر کراہ رہا ہو۔ لیکن ایسا نظر آتا تھا کہ وہ شخص اکیلا نہیں ہے کیونکہ جونہی اس کی آواز آتی برآمدے میں سے کانا پھوسی کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ ساتھ ہی کسی کے قدموں کی چاپ بھی سنائی دیتی تھی۔ لمحہ بھر بعد سب لوگ چپ ہو جاتے اور سناٹا چھا جاتا۔ لیکن پھر وہ چیخیں سنائی دیتیں اور پھر وہی کانا پھوسی۔ اس کے ساتھ ہی کمروں میں پھر وہی بھاگ دوڑ کی آوازیں۔

"کون آیا ہے؟" ایک شخص نے کوچوان کے پاس آکر دھیمے لہجہ میں پوچھا۔

"ڈاکٹر۔"

اس شخص نے اس طرح سانس چھوڑا جیسے بہت دیر سے رکے ہوئے ہو۔ اس نے اپنی چھتری تہ کر لی اور گھبرائی ہوئی نظروں سے مکان کی طرف دیکھا۔ یہ صاحب سٹیفن کے وہی قدیمی دوست اور ہم جلیس محرّر صاحب تھے۔"

محرّر سڑک پر کھڑے کھڑے چار دیواری پر سے احاطہ میں جھانکنے لگا۔ تب یکایک اس نے کسی شخص کو اشارہ سے باہر بلایا اور خود کھسک کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے سے پسینہ چھوٹ رہا تھا جسے وہ بار بار رومال سے پونچھتا جاتا تھا۔

احاطے کا پھاٹک کھلا اور ایک دیہاتی عورت نے پھاٹک سے باہر جھانک کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ایسا نظر آتا تھا جیسے وہ بے حد اندیشناک ہو رہی ہو۔ محرر کو دیکھتے ہی اسکی آنکھیں بھاری سی ہو گئیں اور ان سے آنسوؤں کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔

"کیوں؟ کیا معاملہ ہے؟" محرر نے گھبرا کر پوچھا۔

عورت سسکیاں لینے لگی اور دامن میں منہ چھپا کر روتے روتے بولی۔

"آہ بیچارے بوڑھے پر اس صدمے سے آسمان ٹوٹ پڑا ہے۔ اس کا کلیجہ چور چور ہو گیا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور زبان سب بے حس ہو گئے ہیں۔ صرف رحم کی ملتجی نگاہوں سے وہ چاروں طرف تاک رہا ہے۔"

بات ختم ہونے سے قبل ہی وہ اور بھی زور سے سسکیاں لے کر رونے لگی۔ پھر آنسو پونچھ کر بولی۔ "آپ اندر کیوں نہیں آجاتے؟"

"آنے سے فائدہ ہی کیا ہے!" محرر نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اب کیا ہو سکتا ہے؟"

وہ ایک سرد آہ بھر کر پاس بچھی ہوئی بنچ پر بیٹھ گیا۔ کوچوان نے اس معزز آدمی کے پاس بیٹھنا نامناسب سمجھا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اور اسے تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں نا؟" عورت نے پوچھا۔

"کس کو؟"

"نکولس کو۔"

"نہیں!" مہر نے سراسیمہ ہو کر پوچھا "کیوں؟ کہاں ہے وہ؟"

"آہ! وہ تو اس کوٹھڑی میں ایسا بے فکر ہو کر سو رہا ہے کہ ____"

بیچاری عورت اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کا گلا بھر آیا اور وہ چادر میں منہ چھپا کر پھاٹک کے پیچھے چلی گئی۔

اسی وقت سامنے کے میدان کی طرف سے ایک بوڑھا مہر کے قریب آ کر سرگوشیاں کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں پر نیلے رنگ کا چشمہ تھا اور سر پر اونچی وضع کی ٹوپی۔ کچھ دیر تک احاطے کی طرف جھانکتے رہنے کے بعد وہ بولا۔ "میرے خیال میں اندر چلے چلنا چاہیئے۔ باہر ٹھہرنا مناسب نظر نہیں آتا۔"

مہر نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا اور دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں کے چہروں سے فکرمندانہ سنجیدگی مترشح تھی۔ انہوں نے اپنے چھاتے کھول لیئے اور اس کوٹھڑی کی طرف جو شیفن کا غسل خانہ تھا قدم بڑھایا۔

اس پرانی کوٹھڑی کے نزدیک گاؤں کے بچوں اور عورتوں کی

بھیڑ لگ رہی تھی۔ وہ لوگ بار بار اس کوٹھڑی کی کھڑکی میں سے جھانک رہے تھے۔ کوٹھڑی کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا اور ایک مسلح سنتری اس کے سامنے ٹہلتا ہوا پہرہ دے رہا تھا۔

عورتیں اس کوٹھڑی میں سے جھانکنے کے لئے ایک دوسری پر ٹوٹی پڑتی تھیں۔ دور سے دیکھنے پر کوٹھڑی میں پڑے ہوئے کسی آدمی کے پاؤں نظر آرہے تھے۔ وہ نئے موزوں میں ڈھکے ہوئے تھے عورتیں خائف ہو کر ان کی طرف دیکھ رہی تھیں اور سرگوشیاں کر رہی تھیں۔

"یہ اسی کے پاؤں ہیں؟"

"ہاں ہاں اسی کے۔"

"ذرا مجھے بھی دیکھنے دو تم تو خوب دیکھ چکیں۔ لیکن کیا اب سرکاری معائنہ بھی ہوگا؟"

"بے شک۔"

"خداوندا ——— !"

لوگ آتے تھے اور نمناک آنکھوں سے بار بار اس کھڑکی سے اندر جھانکتے تھے لیکن جیسے وہ اتنے اضطراب سے دیکھ رہے تھے وہ تو اتنی گہری نیند سویا ہوا تھا کہ لوگوں کی رائے زنی کا اسے علم ہی نہ ہو سکتا تھا۔

کسی تھکے ہوئے آدمی کی طرح نکولس کوٹھڑی میں پڑی ہوئی بنچ پر

دائمی نیند میں بے ہوش پڑا تھا۔ قریب ہی اس کی ڈائری پڑی تھی۔
جس کے کھلے ہوئے صفحہ پر ایک مرجھایا ہوا پھول پڑا نظر آ رہا تھا۔

۱۰

دوسرے دن نکولس دفنادیا گیا۔

صبح کا وقت تھا۔ ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف گرجا کی گھنٹیاں اپنے سنجیدہ لہجہ میں خاموش فضا کو ارتعاش آشنا کرتی ہوئی سننے والوں کے دلوں میں ایک طرح کا درد جگا رہی تھیں۔

جنازہ قبرستان کی طرف بڑھنے لگا۔ گاؤں کے سبھی لوگ ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ آگے آگے مقامی گرجا کی حمد پارٹی تھی۔ جو دردناک لہجہ میں مذہبی گیت گاتے جا رہے تھے۔ جب گیت گانے والے چپ ہو جاتے تھے جھاڑیوں کی اوٹ سے یکایک پرندوں کی میٹھی راگنیوں کی ایک دھارا پھوٹ نکلتی تھی۔

جنازے کے ٹھیک پیچھے ایک بڑھیا لڑکھڑاتی ہوئی چل رہی تھی۔ پولیس کا داروغہ اسے اپنے کندھے کا سہارا دئیے تھامے ہوئے تھا۔ بڑھیا کی حالت قابل رحم تھی۔ اسکی آنکھوں میں آنسو ختم ہو گئے تھے وہ کچھ بول سکتی تھی اور نہ رو سکتی تھی۔ فقط دھندلی دھندلی ویران نگاہوں سے میت کی طرف دیکھ کر اپنا سر دھنتی جاتی تھی۔

شہر کے معززین داروغہ کے پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ سب کے دل درد اور کسک سے لبریز تھے۔ ان کی نظریں اس بڑھیا پر مرکوز تھیں۔ ہر شخص کے

دل میں اس بدقسمت ماں اور اس کے مرحوم لخت جگر کے لئے رحم، افسوس
اور ہمدردی کے جذبات اُمڈ رہے تھے۔

محرر حمد پارٹی میں شریک تھا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے ان لوگوں کی قیادت
کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے نزدیک کسی نوجوان کی مرگ بے ہنگام کی
اتنی اہمیت نہیں جتنی ان حمد گانے والوں کی پارٹی کی قیادت۔ وہ کمال یکسوئی
اور انہماک کا اظہار کر رہا تھا اور کبھی کبھی ان کو ٹوک کر ٹھیک طرزوں پر گانے کی
ہدایت بھی کر دیا کرتا تھا لیکن وہ لوگ تو اس کی طرف توجہ ہی نہ دیتے تھے۔

قبرستان میں پہنچ کر کیپاجن جنازے کے قریب آ کر لوگوں کے لئے اپنی
طرف سے ہمدردی کے کچھ الفاظ کہنے لگا۔ لیکن وہ ایک جملہ بھی پورا نہ کر پایا۔
جونہی اس نے کہنا شروع کیا "آپ لوگ اس کے لئے اتنے اندوہگیں نہ
ہوں۔ جوانی کے دنوں میں دنیا سے رخصت ہو جانا کوئی ماتم کرنے کی بات نہیں"

" ماتم کرنے کی بات نہیں ؟" بڑھیا یکایک چیخ اٹھی اور پاگلوں کی طرح
اپنے آپ کو لوگوں سے چھڑانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ داروغہ کا دل بھر
آیا۔ اسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ غمزدہ ہو کر بولا۔" صبر کرو۔ یہ ہمارے بس
کی بات نہیں۔ یہ سب کچھ اس مقدس باپ کے ہاتھ میں ہے۔ رونے چلانے
سے اب فائدہ کیا ہے ؟"

" سب کو ایک دن مرنا ہے اماں !" نائب داروغہ نے بھی اظہار ہمدردی

کرتے ہوئے کہا۔ "ہم سب کو ایک نہ ایک دن یہیں آنا ہے۔"

لیکن میریا نے کسی کی نہ سنی۔ آہستہ آہستہ اس کا سسکیاں لینا آہ وزاری میں تبدیل ہو گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے رونے کے شور میں کیلیا جن کی تقریر کسی کو بھی سنائی نہ دی۔

لاش دفنائی جانے لگی۔

"کولیا!" وہ چلا چلا کر رونے لگی۔ "ارے تو نے کیا کر لیا؟"

داروغہ نے اپنا رومال نکال لیا۔ آس پاس کھڑے سب لوگوں کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔

مٹی ڈال دی گئی۔ لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ قبرستان میں پھر سناٹا چھا گیا۔ اب قبرستان میں وہ بڑھیا رہ گئی تھی یا قریب کی جھاڑیوں پر پھدکتے ہوئے پرندے۔ پرندے تو حسب معمول چہچہا رہے تھے لیکن بدنصیب ماں پھولوں سے ڈھکی ہوئی قبر کے سامنے بیٹھی انتہائی دلخراش آواز میں سسکیاں بھر رہی تھی۔ وہ حسرت بھری نگاہوں سے اس مٹی کے تودے کو دیکھ رہی تھی اور دردناک آواز میں دھیمے دھیمے گنگنا رہی تھی۔

"ہائے بیٹا! ہائے لال . . . . ."

22/10/72